

ہفت روزہ

الفتح

کراچی

۱۳ — ۲۷ جولائی ۱۹۷۲

یہ کراچی ہے

قیمت — ۵۰ پیسے

ہوائی ڈاک سے — [illegible] پیسے

فارغ بخاری



غزل

قہر ہے گنجینۂ افکار خالی ہو گیا
ہر تونگر شہر میں تیرے سوالی ہو گیا

ہر شجر کو آج تنہائی پہ اپنی ناز ہے
کیا موسم ہے کہ گلشن ڈالی ڈالی ہو گیا

جس نے بنجر کھیت سے سونا اُگایا آج وہ
جگ کا اَن داتا شہید قحط سالی ہو گیا

اتنے خنجر پے بہ پے اُترے رگِ احساس میں
جذبۂ دِل کُشتۂ آشفتہ حالی ہو گیا

جنت الفردوس میں ہیں منتظر حور و قصور
مرتبہ میرا برہنہ ہو کے عالی ہو گیا

کس قدر گہرا ہے رشتہ لفظ اور کردار کا
شہر بھر میں شیخ جی کا نام گالی ہو گیا

ایک بھی اِس دور کا شاعر نظر آتا نہیں
میرؔ کوئی بن گیا اور کوئی حالیؔ ہو گیا

خدا کی بستی کے مظلوم عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح
کراچی

جلد ۔ ۳ شمارہ ۔ ۹ ، ۱۰

۱۳ - ۲۷ جولائی سنہ ۱۹۷۲ء

نگران

شوکت صدیقی

⊙

مدیر

ارشاد راؤ

⊙

نائب مدیر

وہاب صدیقی

بدلِ اشتراک	فی پرچہ	سالانہ	سہ ماہی
	۵۰ پیسے	۲۵ روپے	۱۳ روپے
ہوائی ڈاک سے :	۷۵ پیسے	۳۰ روپے	۱۶ روپے

بحرین، کویت :- ۶۰ فلس دوبئی، قطر : ۵ ، درم
سعودی عرب :- ۵ قرش - انگلستان ۲ شلنگ ۶ پنس

مقامِ اشاعت

ہفت روزہ "الفتح" ، ۷ ، ۸ ، ڈی نرسری کمرشل ایریا
پی ای سی ایچ ایس ——— کراچی - ۲۹

ایڈیٹر پبلشر : ارشاد راؤ

مطبع حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد ۔ کراچی

ٹیلیفون : ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

پیپلز پارٹی کہاں ہے ؟

مرکزی وزیر بے محکمہ اور پاکستان پیپلز پارٹی کے ڈپٹی سیکرٹری جنرل جناب خورشید حسن میر نے ایک انٹرویو کے دوران اظہارِ خیال فرمایا تھا ——— "یہ مطالبہ غلط ہے کہ حکومتی عہدے الگ ——— پارٹی عہدے الگ ——— وزیر اور حکومت کے دوسرے عہدوں پر فائز پارٹی کے عہدیدار وہی فرائض انجام دے رہے ہیں جو انہیں پارٹی کے منشور کو عملی جامہ پہنانے کے لیے عہدیدار کی حیثیت سے دینے چاہئیں موجودہ صورت میں وہ زیادہ فعال اور مؤثر انداز میں اپنی ذمہ داریاں پوری کر سکتے ہیں ان کے پاس اختیارات ہیں اور ......"

دراصل یہ ایک وزیر کی سوچ نہیں بلکہ پیپلز پارٹی کی مجموعی فکر ہے ۔ وزارتوں پر جن شخصیات کو فائز کیا گیا ہے ان کی اکثریت ایسے افراد پر مشتمل ہے جو مالی طور پر صاحبِ حیثیت ہیں اور جنہیں جاگیردار یا سرمایہ دار کا نام دیا جا سکتا ہے ۔ ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو انتخابات سے ایک دو مہینے پہلے شامل ہوئے یا پھر الیکشن کے بعد پیپلز پارٹی میں اس لیے آ گئے کہ یہ اکثریتی جماعت ہے ۔ اس عام بھرتی میں داخل ہونے والوں میں زیادہ تر تعداد ان لوگوں کی ہے جو ایوب خان کے بہت قریب رہ چکے ہیں اور اس کے وزیروں کے طور پر کام کر چکے ہیں ۔

اس مجموعۂ وزارت سے اس سوچ کا جنم لینا تعجب خیز نہیں ۔ ہم نے صدر بھٹو کے اقتدار سنبھالنے کے فوراً بعد کہا تھا کہ پارٹی عہدے الگ ——— حکومتی عہدے الگ ——— ! اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ پیپلز پارٹی کے وزراء اور حاکم مزدوروں ، کسانوں اور شاگردوں پر مشتمل کارکنوں کو اپنا زر خرید غلام نہ بنا لیں بلکہ کارکن وزراء اور دوسرے عہدوں پر فائز پارٹی کے ارکان کا گریبان پکڑ سکیں اور غلط کارروائی کی روک تھام میں نہ صرف اپنا بھرپور کردار ادا کریں بلکہ حکومت ، پارٹی کے "ماتحت ہو نہ کہ پارٹی حکومت کے ماتحت !

یہ المیہ ہے کہ صدر بھٹو کو اقتدار ایسے نازک حالات میں ملا کہ مسئلہ ایک نہیں بلکہ ایک ہزار مسائل تھے اور ہیں ۔ ان حالات میں وزارتوں پر فائز ہونے والوں نے صدر کی مصروفیات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا ۔ انہوں نے "سب اچھا" کی رپورٹیں پیش کر کے پارٹی اسلام آباد میں سجا دی ۔ اس پر کارکن چیخے ——— "ہماری پارٹی واپس کرو ، جاگیرداروں سے پارٹی کو آزاد کراؤ ۔" جے ۔ اے ۔ رحیم نے ایک نہ سُنی الٹا کارکنوں کو چارج شیٹ دیئے بغیر پارٹی سے ایسے خارج کر دیا جیسے کوئی جاگیردار اپنی زمینوں سے ہاریوں کو نہ صرف بے دخل کرتا ہے بلکہ اپنے اثر و رسوخ سے انہیں ذلیل کرتا ہے اور ان کو تھانوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیتا ہے ۔

کراچی ، جے ۔ اے ۔ رحیم اور ان کے حواریوں کی اس ناعاقبت اندیش پالیسی کی بدترین آماجگاہ رہا ہے ۔ کراچی کے کارکنوں کو بے دردی سے "ذبح"

باقی صفحہ ۴۳ پر ملاحظہ فرمائیں ۔

نیپ اور جماعت اسلامی کی موقع پرستی



عثمانی نے نیپ کے منشور کو روند ڈالا

وقائع نویس

اردو اور سندھی زبان کا احترام اپنی جگہ مگر دائیں اور بائیں بازو کی دو سیاسی جماعتوں نے لسانی مسئلے کو اچھا کر جس گھناؤنے انداز سے سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی وہ اپنی جگہ ایک انتہائی تکلیف دہ حقیقت ہے۔

نیپ اور جماعتِ اسلامی اپنی سیاسی دکان چمکانے کے لیے ہمیشہ انتشار اور لاقانونیت کو ہوا دیتی ہیں۔ ان دونوں سیاسی جماعتوں کو اردو سے اتنی محبت نہیں جتنی انہیں اپنے سیاسی اغراض کے حصول سے ہے۔ نہ ہی وہ صوبے میں اردو کو جائز مقام دلانے کے لیے جماعتی سطح پر جان و مال کی قربانیاں دینے کا حوصلہ رکھتی ہیں۔ کراچی کے حالیہ واقعات اس بات کی شہادت دیں گے کہ پولیس یا فوج کی گولیوں کا نشانہ عام لوگ بنے۔ مرنے والوں میں جماعتِ اسلامی یا نیپ کا ایک بھی کارکن شامل نہیں۔ یہ ہمیشہ آگ بھڑکا کر دور سے تماشہ دیکھنے کی عادی ہیں۔ جماعتِ اسلامی اور نیپ نے اس مسئلے سے کس طرح سیاسی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اس کا ایک واقعہ پیشِ خدمت ہے۔

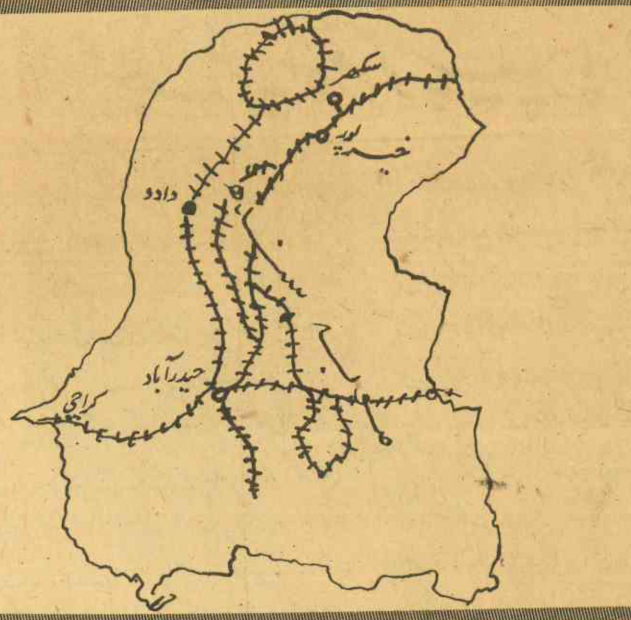
نیپ نے اپنے منشور میں مغربی پاکستان کو چار قومیتوں کا علاقہ قرار دے دیا۔ سندھی، بلوچی، پٹھان اور پنجابی! اس کے علاوہ اس کے منشور کے مطابق یہاں کسی پانچویں قومیت کا نام و نشان تک نہیں ہے لیکن سندھ میں جوں ہی لسانی مسئلہ کھڑا ہوا، نیپ کے سیکرٹری جنرل محمود الحق عثمانی نے حیدر آباد میں پارٹی کارکنوں سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

"سندھی کے ساتھ ساتھ اردو کو بھی سرکاری زبان کا درجہ دیا جائے کیونکہ اردو بولنے والوں کو پانچویں قومیت کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر اردو داں طبقہ کے اس مطالبے کو تسلیم نہ کیا گیا تو نیپ کراچی کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک کی بھرپور حمایت کرے گی"

محمود الحق عثمانی کے اس بیان کے مطابق مغربی پاکستان میں پانچویں قومیت اردو بولنے والوں کی ہے یہاں ہمارا مقصد اردو داں طبقے کی دل آزاری مقصود نہیں۔ ہم صرف نیپ کے رہنماؤں کی منافقت اور ان کے درمیان تضادات کو سامنے لانا چاہتے ہیں۔ جس کا مقصد ملک میں تشدد اور انتشار کو پھیلا کر مفاد پرستوں، تخریب کاروں اور علیحدگی پسندوں کی حوصلہ افزائی ہے۔

محمود الحق عثمانی کے اس بیان پر نکتہ چینی کرتے ہوئے نیشنل عوامی پارٹی نواب شاہ کے کنوینر مسٹر رشید احمد ایڈووکیٹ، نیپ سندھ کے صدر مسٹر عزیز اللہ شیخ اور دوسرے رہنماؤں نے کہا کہ "عثمانی صاحب کا یہ بیان نیپ کے منشور کی خلاف ورزی ہے کیونکہ نیپ مغربی پاکستان میں صرف چار قومیتوں پر یقین رکھتی ہے!" نیپ کے سیکرٹری جنرل نے اس بات پر ہی اکتفا نہ کیا کہ بلکہ نیپ کے منشور کی دھجیاں اڑاتے ہوئے اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ ——— "اگر سندھی کے ساتھ اردو کو صوبے کی سرکاری زبان کا درجہ نہیں دیا گیا تو نیپ کراچی کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک کی بھرپور حمایت کرے گی۔"

محمود الحق عثمانی کے اس بیان سے ہمارے مذکورہ بالا موقف کی تائید ہوتی ہے کہ نیپ کو اردو سے قطعی محبت نہیں ہے بلکہ وہ اس مسئلے کی آڑ میں علیحدگی پسندی کو ہوا دے رہی ہے۔ وہ سندھ میں سندھی اور اردو بولنے والوں کو آپس میں لڑا کر سندھ کی ہزاروں سال پر مشتمل صلح و آشتی، اخوت و محبت کی روایات پر تعصب اور نفرت کا غلاف چڑھانا چاہتی ہے۔



ہنگامے اور فسادات بلدیاتی انتخابات میں مہاجرین کے ووٹ حاصل کرنے کے لئے کرائے گئے

اُرْدُوْ کے نام پر

سِندھی مہاجر عوام کے خلاف ۲۰ لاکھ روپے کی سازش

الفتح رپورٹ

سندھ کو "باب الاسلام" کہا جاتا ہے۔ آج یہ "بابُ لاسلام" جھلسا ہوا ہے۔ ہر طرف ہنگامے ہوئے۔ ہڑتالیں اور مظاہرے ہوئے۔ آتش زنی، توڑ پھوڑ، لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا دور دورہ رہا۔ مسلمان، مسلمان کے خون کے پیاسے ہو گئے۔ اس المیئے کا آغاز زبان کے تنازعہ سے ہوا۔ اردو کی حمایت میں تحریک شروع ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سندھی، مہاجر فسادات کی شکل اختیار کر لی۔

اُدھر موت اور تباہی کی گرم بازاری تھی۔ دوسری طرف سرمایہ داروں کی تنظیم آل پاکستان ٹیکسٹائل ملز ایسوسی ایشن کی جانب سے بعض اخبارات میں چوتھائی صفحے کا لمبا چوڑا اشتہار چھاپا گیا۔ اس میں انتشار اور لاقانونیت کی ذمہ داری محنت کشوں پر عائد کی گئی۔ مزدور رہنماؤں کو تخریب کار اور وطن دشمن قرار دیا گیا۔ صنعتوں کو قومی ملکیت قرار دینے کی پالیسی کی کھلم کھلا مخالفت کی گئی۔ حکومت کے قوانین کو جنگل کا قانون بتایا گیا۔ ٹریڈ یونین سرگرمیوں کو غنڈہ گردی کہا گیا۔ یہ اشتہار نہیں تھا سرمایہ داروں کی جانب سے کھلم کھلا دھمکی تھی۔ حکومت کو بلیک میل کرنے کی کوشش تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ اشتہار صرف جماعت اسلامی کے ترجمان "جسارت" اور مودودیوں کے نیم سرکاری ترجمان "جنگ" کو اشاعت کے لئے دیا گیا۔ اس سے بھی زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ یہ اشتہار ایسے وقت شائع کر دیا گیا جب سندھ قتل و غارت گری کے شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کے تین واضح اسباب ہیں

(۱) پچھلے دنوں کراچی کے مزدوروں کی جو انقلابی تحریک ابھری تھی اسے سبوتاژ کرنا، مزدوروں میں خوف اور دہشت زدگی پھیلانا اور انہیں ان کی جائز جد و جہد سے گمراہ کرنا۔

(۲) سندھ اور بیرون سندھ کے عوام کے ذہنوں میں یہ تاثر پیدا کرنا کہ مہاجر سندھی فسادات میں جماعت اسلامی، نیپ اور سرمایہ داروں کے ایجنٹوں کے بجائے ٹریڈ یونین رہنماؤں بائیں بازو کے سیاسی کارکنوں اور انتظامیہ کا ہاتھ ہے۔

(۳) حکومت کو بلیک میل کرنا کہ اگر اس نے سرمایہ داروں کے آگے ہتھیار نہ ڈالے تو مہاجر سندھی فسادات اور ایسے ہی دوسرے ہتھکنڈوں کے ذریعے لاقانونیت اور انتشار پھیلایا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے قدم قدم پر مشکلات پیدا کی جا سکتی ہیں۔

حالانکہ یہ ایک کھلی حقیقت ہے کہ مہاجر سندھی فسادات سے صنعتی مزدوروں کا دور دور تک کوئی تعلق نہیں۔ نہ انہوں نے اس میں کوئی حصہ لیا اور نہ آئندہ ایسا ارادہ رکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ متوسط طبقے کے دو فریقوں کے درمیان ملازمتوں اور عہدوں کی تقسیم کا جھگڑا ہے۔ جس کا محنت کشوں کے بنیادی مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ہنگاموں کے دوران نہ انہوں نے کسی مظاہرے میں حصہ لیا۔ نہ ہڑتال میں شرکت کی۔

علاوہ ازیں اردو تحریک جس طرح شروع کی گئی۔ اس میں نہ تو ٹریڈ یونین تنظیموں سے رجوع کیا گیا نہ بائیں بازو کے سیاسی رہنماؤں اور دانش وروں کا تعاون حاصل کیا گیا۔ صرف یہی نہیں کراچی میں بسنے والے پنجابیوں، پٹھانوں، بلوچوں، سندھیوں اور گجراتیوں سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا گیا۔ اس کے برعکس اُردو کے مسئلہ کو صرف مہاجرین کا مسئلہ بنا کر پیش کیا گیا۔ حالانکہ اردو قومی زبان ہے۔ مہاجرین کی طرح وہ غیر مہاجرین کو بھی عزیز ہے۔ خصوصیت کے ساتھ اہل پنجاب کو جنہوں نے اردو کی سب سے زیادہ خدمت کی۔

جب عالیہ امام کو پیپلز پارٹی سے دھتکار دیا گیا

جنہوں نے اردو زبان و ادب کو فروغ دینے میں تاریخی کردار ادا کیا۔ معیاری ادب پیدا کیا۔ ممتاز اہل قلم پیدا کئے۔ اردو صحافت کی نشوونما کی۔ فن طباعت میں اعلیٰ ترین تجربے کئے۔ اردو کا مقام بلند کیا۔ اسے بین الاقوامی زبانوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ یہ ایسی واضح حقیقت ہے۔ جسے نظر انداز کرنا صداقت اور دیانت کو جھٹلانا ہے۔

کیا یہ حقیقت نہیں ہے کہ اردو کے نام پر جن لوگوں کو نمائندہ بنا کر بھیجا گیا۔ ان میں کوئی پنجابی، پٹھان، بلوچ، سندھی اور گجراتی شامل نہیں۔ کیا اردو صرف مہاجرین کی زبان ہے؟ کیا کراچی میں صرف مہاجر بستے ہیں؟ اسی شہر کراچی میں پنجاب کے رہنے والے ممتاز حسن اور غلام عباس موجود ہیں۔ ممتاز حسن نے زندگی بھر اردو کی خدمت کی۔ انہیں اردو کے شیدائی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے غلام عباس اردو کے ممتاز ترین افسانہ نگار ہیں۔ انہوں نے اپنے ادب کے ذریعے اردو کو ایک بلند مقام دیا۔ ان کے علاوہ ضیا جالندھری ہیں۔ حمید نسیم ہیں۔ سید انور ہیں۔ یہ سب ادب کے بڑے نام ہیں۔ اردو جن کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ اِس شہرِ کراچی میں پشاور کے ممتاز شاعر مجید شاہد ہیں۔ گجراتی بولنے والے اختر حسین ہیں جو انجمن ترقی اردو کے صدر رہیں۔ ان کی مادری زبان ہرچند کہ اردو نہیں مگر اردو کی خدمت میں ان کا جس قدر بھی حصہ ہے وہ بہت وزنی اور گرانقدر ہے۔ اِسی طرح سندھی کے پیر حسام الدین راشدی اور شمشیر الحیدری ہیں جنہوں نے سندھی کے ساتھ ساتھ اردو ادب بھی تخلیق کیا اور جنہیں اردو بھی اتنی ہی عزیز ہے جتنی سندھی۔ ان کے علاوہ باقی بلوچ ہیں۔ جو بلوچ ہونے کے باوجود اردو کے ایک ممتاز شاعر ہیں بلکہ قومی سیاست میں بھی ان کا اپنا مقام ہے۔

یہ تمام وہ لوگ ہیں جن کا زندگی میں اردو کے ساتھ چولی دامن کا رشتہ ہے۔ انہوں نے اپنے ادب و فن سے اردو کی خدمت کی ہے۔ اردو جن کا مستقبل ہے۔ اردو کی خدمت جن کا نصب العین ہے۔ جو صرف اردو ہی کے ذریعے پہچانے جاتے ہیں۔ اردو نہ رہے تو وہ۔ نام رہ جائیں۔

نہ صرف یہ کہ کسی غیر مہاجر کو اردو کی نمائندگی میں شریک نہیں کیا گیا بلکہ جب صدر بھٹو نے سیاست دانوں کے ساتھ دانش وروں میں ابنِ انشاء کو بھی اردو کے نمائندے کی حیثیت سے اسلام آباد آنے کی دعوت دی تو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کی قیام گاہ پر ایک جلسے میں ان نمائندوں کے بارے میں غور و خوض کیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ ابنِ انشاء کے نام پر صرف اس لئے مخالفت کی گئی کہ وہ پنجابی ہیں۔ حالانکہ ابن انشاء نے اردو کی جس قدر خدمت کی ہے۔ وہ ایک کھلی کتاب ہے۔ وہ نہ صرف اردو کے ایک نہایت ممتاز شاعر ہیں بلکہ متعدد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کے شگفتہ اور دل نشین انداز تحریر کی ہر طرف دھوم ہے۔ اردو میں ایسے صاحب طرز انشاء پرداز خال خال نظر آتے ہیں۔

اسی طرح شوکت صدیقی اور ابراہیم جلیس کے ناموں پر بھی ہنگامہ کھڑا کیا گیا۔ حکومت کو دھمکیوں کے تار بھیجے گئے۔ صرف اس لئے کہ یہ دونوں جماعت اسلامی سے اختلاف رائے رکھتے تھے۔ حالانکہ دونوں بین الاقوامی شہرت کے اہل قلم ہیں جنہوں نے اپنی گرانقدر تخلیقات کے ذریعے غیر ملکی زبانوں سے اردو کو روشناس کرانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا ہے۔ اردو کو ان پر فخر ہے اور ان کو اردو پر فخر ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اردو کے جملہ حقوق جماعت اسلامی اور نیپ کے اس اسلام پسند دھڑے کے نام الاٹ ہو چکے ہیں، جو عثمانی گروپ کہلاتا ہے۔ اردو پر صرف مہاجروں کی اجارہ داری ہے۔ اردو قومی زبان نہیں۔ پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ کی زبان نہیں۔ صرف کراچی کے لالوکھیت اور ناظم آباد کی زبان ہے۔ اردو کا مسئلہ صرف مہاجرین کا مسئلہ ہے۔ لالوکھیت اور ناظم آباد کے رہنے والوں کا مسئلہ ہے۔

غرضیکہ اردو کے نامور اہل قلم کے بجائے ایسے لوگوں کو اردو کا نمائندہ بنا کر اسمگل کیا گیا جن میں اسلامی جمعیت طلباء کے ایک کارکن۔ این۔ ایس۔ الیف (کاظمی گروپ) کے ایک اسلام پسند لیڈر اور عالیہ امام شامل تھیں۔ یہ وہی عالیہ امام ہیں جو ڈاکٹر بھی کہلاتی ہیں لیکن اب تک یہ عقدہ نہ کھلا کہ یہ گھوڑوں کی ڈاکٹر ہیں یا ہومیو پیتھ ہیں۔ بہرحال وہ ڈاکٹر ہوں یا کمپونڈر علم و ادب سے ان کا دور دور تک تعلق نہیں۔ اردو انہیں لکھنا تک نہیں آتی۔ ان کے اخباری بیانات دوسرے لوگ لکھتے ہیں۔

ایک سفارشی گھپلے میں عالیہ تین سال کے لئے چین چلی گئیں کام ان کا انگریزی سے اردو ترجمہ کرنا تھا۔ مگر تین سال میں انہوں نے مع اپنے شوہر کے صرف تین صفحے ترجمہ کئے اور چینیوں کی شرافت اور مروت سے مسلسل فائدہ اٹھاتی رہیں۔ ان کے ساتھ ایک اور پاکستانی سراج رضوی بھی ان دنوں اسی کام پر مامور تھے۔ وہ ان کے تین صفحاتی ترجمے کا شاہکار لئے پھرتے ہیں۔ یہ ترجمہ سرتاپا غلط ہے۔ زبان بھونڈی اور گنجلک ہے۔ جملے بے ربط ہیں۔ املا پرائمری کے طلباء سے زیادہ ناقص ہے۔ یہ اردو سے ان کے تعلق کی منہ بولتی تصویر ہے۔

یہ وہی عالیہ امام ہیں جو گزشتہ اپریل میں نیپ سے رسی تڑا کر اچانک پیپلز پارٹی کا دم بھرنے لگی تھیں۔ ان دنوں صدر بھٹو کو قائد عوام کہتے ان کا منہ سوکھتا تھا۔ ہر وقت پیپلز پارٹی کے صدر دفتر کا طواف کرتی نظر آتیں۔ بات صرف اتنی تھی کہ سندھ صوبائی اسمبلی کے لئے خواتین کی نشستوں کا انتخاب ہونے والا تھا۔ انہوں نے بھی ایک امیدوار کی حیثیت سے اپنی عرضی لگا دی۔ اخبارات میں یہ خبر بھی شائع کرا دی کہ پیپلز پارٹی کے ٹکٹ کے لئے یہ بھی امیدوار ہیں۔ غرضیکہ اس زمانے میں ان کا کام پیپلز پارٹی کے عہدے داروں کے گھروں پر حاضری دینا تھا۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر اپنے حق میں سفارشیں پہنچانا تھا۔ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کی خوشامد اور چاپلوسی تھا۔ انہوں نے ہر حربہ آزمایا مگر گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا۔ پیپلز پارٹی نے انہیں منہ نہ لگایا۔ صاف دھتا بتایا۔

اب یہ پیپلز پارٹی سے انتقام لیتی ہیں۔ اس کے خلاف زہر اگلتی ہیں۔ اردو کا دم بھرتی ہیں۔ ایک بار پھر نیپ کی شاخ پر بسیرا کرتی ہیں۔ نیپ کا آج کل یہ عالم ہے کہ جب سے دو صوبوں میں معمولی اکثریت کے ساتھ اُسے برسر اقتدار آنے کا موقع ملا ہے۔ اِسلام پر بے ساختہ فریفتہ ہو گئی ہے۔ سرحد میں اُس نے مفتی محمود کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے۔ کراچی میں محمود الحق عثمانی کی سرکردگی میں اسلام پسندوں کی حلقہ بگوش بن گئی ہے اور اسلام کے ساتھ ساتھ اردو کے درد میں بھی مبتلا ہو گئی ہے۔

نیپ کا آج کا نعرہ اردو ہے۔ کل وہ اردو کو قومی زبان بنانے کی شدید مخالف تھی۔ اسے ثقافتی اقلیت کی زبان بتاتی تھی مغربی پاکستان میں چار قوموں اور چار قومی زبانوں کی تحریک اسی نے شروع کی۔ اردو کے بجائے انگریزی کو رابطہ کی زبان بنانے

باقی صفحہ ۳۳ پر ملاحظہ فرمائیں

محمود الحق عثمانی اردو کو صرف لالوکھیت اور ناظم آباد کی زبان بنانا چاہتے ہیں



احوالِ واقعی



صدر بھٹو نے دوبار سندھ حکومت کو بحران سے بچایا

کیا ہر درد کی دوا ہمیشہ صدر بھٹو ہی رہیں گے؟

یال ینتہ اء

سندھ میں گذشتہ دو ہفتوں سے حالات نے جو صورت اختیار کر رکھی تھی، وہ صدر بھٹو کی نشری تقریر نئے اور پرانے سندھیوں کے درمیان ایک متفقہ فارمولا طے ہو جانے کے بعد خاصی تبدیل ہو گئی ہے۔

یہاں ہم "لسانی بل" کے عیوب اور محاسن پر بحث نہیں کریں گے، اس پر بہت کچھ کہا جا چکا ہے۔ سندھ کے وزیرِ اعلیٰ اور صدر بھٹو دونوں بل کو پڑھنے کی دعوت دے چکے ہیں، لیکن "بل" میں بہرحال کوئی خامی ضرور تھی۔ جس کی وجہ سے سب کچھ ہوا اور خود حکومت کو ایک آرڈیننس جاری کرنا پڑا۔ اگر یہ خامی بل میں ہی دور کر لی جاتی تو حالات یہ سنگین صورت اختیار کرتے، نہ اتنی مائیں اپنے بیٹوں کی موت کا دکھ برداشت کرتیں اور نہ ذہنوں میں نفرت جڑ پکڑتی۔

آرڈیننس پر نئے سندھیوں کے "خود ساختہ" رہنماؤں نے بھی اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ خود ساختہ اس لئے کہ یہ عوام کے منتخب نمائندے نہیں ہیں۔ اور عوام میں بل کے خلاف جو نفرت پھیلی تھی۔ وہ ایک بے ساختہ اظہار تھا۔ اس میں ان رہنماؤں کی قیادت کا کوئی دخل نہ تھا۔ ان کو قیادت کا موقع سندھ کی حکومت نے دیا۔ جس نے سیاسی حکومت ہونے کے باوجود غیر سیاسی طریق کار اختیار کر رکھا ہے۔

ہمیں یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ سندھ میں کسی قسم کی بھی گڑبڑ ہو اور کوئی مسئلہ ہو، سندھ حکومت اور سندھ پیپلز پارٹی بے بس ہو جاتی ہے۔ تمام نظریں صدر بھٹو کی طرف اُٹھتی ہیں۔ صدر بھٹو بھی ہمیشہ ایک "گرو" کی طرح تشریف لاتے ہیں، قوم سے خطاب کرتے ہیں۔ لوگوں سے ملتے ہیں اور مسئلہ حل کر کے چلے جاتے ہیں۔ کچھ ہفتوں بعد سندھ حکومت پھر اُن کے لئے اس کا موقع پیدا کر دیتی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خود سندھ حکومت کس مرض کی دوا ہے۔ اب تو ہر درد کی دوا ہیں صدر بھٹو۔ اس سے پہلے مزدوروں کا مسئلہ پیدا ہوا۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ اب یہ زبان کا مسئلہ الجھا، تب بھی صدر بھٹو نے ہی نسخہ تجویز کیا۔ پنجاب میں بھی پیپلز پارٹی کی حکومت ہے۔ وہاں یہ صورت کیوں پیدا نہیں ہوتی۔ گورنر کھر نے پولیس ہڑتال پر خود قابو پا لیا تھا۔ اور کئی واقعات رونما ہوئے۔ ان پر بھی اس طرح قابو پا لیا گیا۔

صدر بھٹو کے علاوہ اس مسئلے کو حل کرنے کا سہرا غوث بخش بزنجو کے سر رہا۔ ولی خان اب ان کی تشہیر کرتے پھرتے ہیں۔ بقول صدر بھٹو، بزنجو صاحب نے ہی تہران میں مشورہ دیا کہ سندھی کو صوبائی زبان بنانے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے۔ اب متفقہ فارمولا طے کرنے میں بھی بزنجو نے نمایاں کردار ادا کیا۔ بزنجو اتنے بڑے سیاست دان ہیں تو انہوں نے وہیں تہران میں یہ متفقہ فارمولا کیوں نہ بتایا۔ تاکہ بل میں ان باتوں کی پہلے سے گنجائش رکھ لی جاتی اور یہ خونریزی کے واقعات نہ ہوتے۔

کشمکش زبان کی ہو یا کسی بھی مسئلے پر سینکڑوں غریب ماؤں کو اپنے بچوں کی موت کے گہرے زخم مل جاتے ہیں۔ نفرت انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ دلوں میں نفرت راسخ ہو جاتی ہے۔ پھر ہر متنازعہ موقع پر یہ نفرت ظاہر ہوتی ہے۔

سندھ میں پیپلز پارٹی انتخابات سے پہلے بھی ایک

تحریک نہیں بن سکی تھی۔ یہاں اگر پارٹی نے انتخابات جیتے بھی تو وڈیروں کی مدد سے۔ (انتخابات سے اگلے ہفتے "الفتح" نے یہی تجزیہ کر دیا تھا) سندھ صوبائی اسمبلی میں تو پیپلز پارٹی کو واضح اکثریت بھی نہیں ملی تھی۔ اس وقت پارٹی کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے ارکان ۲۸۔ اور ۲ خواتین ہیں۔ کل ۳۰ اور باقی گیارہ آزاد ارکان ہیں۔ جو پیپلز پارٹی میں شامل ہوتے ہیں۔ حکومت ملنے سے پہلے بھی سندھ میں پیپلز پارٹی عدم تنظیم کا شکار ہو گئی تھی۔ حکومت ملنے کے بعد تو پیپلز پارٹی کی تنظیم کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا تھا۔ کراچی میں سیاسی خلا پیدا ہو چکا ہے کیونکہ مسٹر جے اے رحیم نے کراچی میں جو نئی تنظیم بنائی ہے، اُسے کراچی کے لوگ کیا پیپلز پارٹی کے کارکن تک نہیں جانتے۔ یہی حال سندھ کا ہے۔ وہاں اثر و رسوخ کی وجہ وزیروں کی وزارت ہے یا وڈیرے کا اپنا اثر۔ پارٹی کے عہدوں کی نسبت سے کوئی قابلِ عزت نہیں ہے۔ پیپلز پارٹی نے اردو بولنے والے علاقوں کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ انتخابات میں بھی ان علاقوں میں پیپلز پارٹی کو اس لئے مار پڑی تھی کہ یہاں پارٹی نے کوئی کام ہی نہیں کیا۔ مثال کے طور پر ناظم آباد کے علاقے میں پیپلز پارٹی نے کوئی امیدوار ہی کھڑا نہیں کیا تھا۔ لیاقت آباد میں برائے نام امیدوار کھڑا کیا۔ پھر بھی اس کو محمود الحق عثمانی اور علی مختار رضوی سے کہیں زیادہ ووٹ مل گئے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں کے عوام پیپلز پارٹی کو پسند کرتے تھے۔ انتخابات میں مار کھانے کے بعد پیپلز پارٹی نے اُن علاقوں کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سندھ میں پیپلز پارٹی سندھیوں کی جماعت کی حیثیت سے ابھرتی رہی۔ اردو بولنے والے اور دوسرے سندھی ـــــ اس سیاسی خلاء کی وجہ سے رجعت پرست جماعتی قسم کے رہنماؤں کے رحم و کرم پر پڑے رہے یہ رہنما اپنے فلسفے کے مطابق ان علاقوں میں ترقی پسندی کے اصولوں کے خلاف زہر پھیلاتے رہے۔ مگر ان لوگوں کو صحیح رہنمائی کبھی نہ مل سکی۔ جب اس بل کا مرحلہ پیش آیا اس وقت بھی ان رجعت پرست رہنماؤں نے تو اس کی خامی سے پوری طرح فائدہ اٹھایا اور خوب ہوا دی۔ مگر پیپلز پارٹی کی طرف سے سرکاری یا جماعتی سطح پر ایسی کوئی کوشش نہ کی گئی کہ ان حسّاس علاقوں میں سیاسی عمل کرتی۔ بل کے متعلق ان کا جو موقف تھا وہی بیان کیا جاتا۔ مگر انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ صوبائی اسمبلی میں ہمیں اکثریت حاصل ہے، پاس ہو ہی جائے گا۔ یہ اندازہ نہ کیا کہ اردو بولنے والوں میں یہ تاثر پھیل چکا ہے کہ ان کا مستقبل خطرے میں ہے ـــــ اور وہ اس کے

گیارہ آزاد ارکان کی دھمکی نے سندھ وزارت کو خطرے میں ڈال دیا

لئے مرنے مارنے پر تل چکے ہیں ـــــ اس کے لئے جوابی کارروائی کے طور پر عوام میں کچھ کام کیا جائے۔ بہرحال وہ بھی سندھ میں رہتے ہیں۔ ان کے مستقبل کا تحفظ سندھ حکومت کی ذمہ داری ہے۔

بل جس روز پیش ہونا تھا، اس صبح ایک میٹنگ بھی ہوئی۔ اسمبلی کے سرکاری ارکان ترمیم کے لئے تیار بھی ہو گئے۔ مگر اس میٹنگ میں اپوزیشن کے سندھی ارکان بھی شامل تھے۔ انہوں نے احتجاج کیا اور پارٹی میں شامل گیارہ آزاد ارکان نے بھی دھمکی دے دی کہ اگر ترمیم کی گئی تو وہ نشستیں تبدیل کر لیں گے۔ یہ بہت بڑی دھمکی تھی۔ کیونکہ ان گیارہ ارکان کے جانے سے پیپلز پارٹی کی وزارت خطرے میں پڑ جاتی۔ اپوزیشن اکثریت میں ہو جاتی۔ ممکن ہے پارٹی کے کچھ ارکان بھی غیر جانب دار ہو جاتے ـــــ اس بحران کو در پیش دیکھ کر ـــــ اپنی وزارتوں کو بچانے کے لئے یہ بل اسی طرح پیش کر دیا گیا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا اسے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس حکومت کی بنیادیں اتنی جلدی ہل سکتی ہیں، وہ اصولوں کے لئے کہاں تک ڈٹ سکتی ہے؟ صوبے میں وہ سیاسی پارٹی کی حیثیت سے سیاسی عمل بھی نہیں کر رہی ہے اور خود اس کا وجود اتنے خطرے میں رہتا ہے۔ وہ اپنے منشور پر کس طرح عمل کرے گی۔؟

اگر یہ جھگڑے شروع ہو ہی گئے تھے تو ان کا سیاسی تدارک کرنے کی ضرورت تھی۔ گڑبڑ والے علاقوں میں پیپلز پارٹی کے عہدیدار اور وزیر جا کر حالات کا مقابلہ کرتے۔ سیاسی حکومت کا طریق کار یہی ہوتا ہے۔ سیاسی حکومت بھی پولیس اور فوج سے ہی حالات کو قابو میں لائے گی تو فوجی اور سیاسی حکومت میں کیا فرق رہ جائے گا۔ پیپلز پارٹی کے دفتر تباہ ہوئے، پرچم ہٹا دیے گئے۔ وزیروں نے



اپنی کاروں اور بنگلوں سے قومی پرچم ہٹا دیے۔ کتنے افسوس کی بات ہے کہ منتخب عوامی نمائندے ـــــ عوام سے اس طرح خوف زدہ ہوں۔

یہ رجحان ہمارے نزدیک انتہائی تشویش ناک اور خطرناک ہے کہ سندھ کی حکومت ـــــ مسائل کے حل کے لئے سیاسی اور جمہوری طریقے اختیار نہیں کر رہی ہے۔ عوام کے درمیان جو تلخیاں اور نفرتیں موجود ہیں۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے انہیں دور کرنے کے لئے کوئی سیاسی اقدامات نہیں کئے۔ یہ تو ہر وزیر کہتا ہے کہ عوام ہمارے ساتھ ہیں۔ لیکن عوام سے رابطہ برقرار نہیں رکھا جاتا۔

یہ رجحان بھی بالکل غلط ہے کہ کوئی مسئلہ پیدا ہو جائے۔ وہ اسی وقت حل ہوتا ہے۔ جب صدر بھٹو مداخلت کرتے ہیں، وہ خود کہتے ہیں کہ میرے ہاتھوں پر اتنے مسائل پڑے ہوئے ہیں ان کے لئے اور مسائل پیدا نہیں کرنے چاہئیں۔

لسانی تنازعہ کا پس منظر

اِدھر نواب صاحب، اُدھر سیّد صاحب

بیچارے عوام مارے گئے





وہاب صِدّیقی

سندھ۔ پانچ ہزار سالہ تہذیب کا گہوارہ، لال شہباز قلندر سچل سرمست کا دیس، شاہ لطیف بھٹائی کی کافیوں کا وطن، ہوش محمد ایسے جانباز، حریت پسند اور سامراج دشمن کا وطن، ہاریوں کی دھرتی محنت کشوں کی سرزمین، قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کو سینے سے لگانے والا صوبہ، آج لسانی تنازعہ کی آگ میں جل رہا تھا۔ اس کی گندم کے سنہری خوشوں کا حسن اور کھیتوں کی ہریالی چھین لی گئی۔ کارخانوں کی رونق مدھم پڑ گئی۔ ہر طرف اداسی، رنج والم، بے چینی اور اضطراب کا دور دورہ تھا۔

اردو۔ سندھی تنازعہ کا آغاز ۱۹۵۸ء میں ہوا جب ایوب حکومت نے ایک زبانی حکم کے ذریعے سندھی کو میٹرک تک ذریعہ تعلیم سے گھٹا کر پرائمری تک کر دیا۔ اور چند سال بعد پرائمری سے بھی ختم کرنے کی کوشش کی۔ ردّعمل کے طور پر سندھی کے بعض ادیبوں اور دانش وروں نے شیخ ایاز کی قیادت میں "جئے سندھ" کی تحریک کا آغاز کیا جسے نیپ کی تائید اور سرپرستی حاصل تھی۔ سیاسی میدان میں جی ایم سید اور پیر علی محمد راشدی نے "سندھ متحدہ محاذ" بنا کر "جئے سندھ" تحریک کو اپنے سیاسی مقاصد کا آلہ کار بنایا۔ اس کے جواب میں نواب مظفر حسین نے اردو کے تحفظ کا نعرہ بلند کرتے ہوئے "مہاجر، پنجابی، پٹھان متحدہ محاذ" قائم کیا۔ بظاہر جی۔ ایم۔ سید اور نواب مظفر کی تحریکیں ایک دوسرے سے متصادم ہیں لیکن پس پردہ ان کی اقدار اور مقاصد مشترک ہیں۔ دونوں وڈیرے ہیں۔ دونوں کا تعلق استحصالی طبقوں سے ہے۔ نواب مظفر ہاری کا استحصال کرتے وقت سندھی اور غیر سندھی میں تمیز نہیں کرتے اسی طرح جی۔ ایم سید بھی پرانے اور نئے سندھی ہاری میں تمیز نہیں کرتے دونوں کا مقصد جاگیردارانہ نظام کو برقرار رکھنا ہے۔

اسی دوران میں نیشنل عوامی پارٹی (ولی گروپ) اور سوویت ترمیم پسندوں کے ادبی محاذ "عوامی ادبی انجمن" کی جانب سے "پانچ قوموں اور پانچ زبانوں" کا نعرہ بلند ہوا۔ کہا گیا کہ پاکستان میں پانچ قومیں بنگالی سندھی، بلوچی، پنجابی اور پختون بستی ہیں۔ ان کی پانچ زبانیں ہیں۔ بنگلہ سندھی۔ بلوچی۔ پنجابی اور پشتو، رابطہ کی زبان اردو قرار دی گئی۔ لیکن جب سرحد اور بلوچستان میں ولی نیپ کی حکومت قائم ہوئی تو اس نے پشتو اور بلوچی کو صوبائی زبان بنانے کی بجائے اردو کو صوبائی زبان کا درجہ دیا۔ مقصد یہ تھا کہ پنجاب اور سندھ کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے اردو کا حربہ استعمال کیا جائے۔ پنجاب نے بھی جہاں پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت قائم ہوئی اردو کو صوبائی زبان قرار دیا گیا۔ ان تینوں صوبوں میں اردو کو صوبائی زبان بنانے کی وجہ یہ بھی تھی کہ پشتو بلوچی اور پنجابی کسی بھی دور میں صوبائی زبانیں نہیں رہیں۔ ان کو پھلنے پھولنے اور ترقی کا موقع نہیں ملا اور نہ ہی ان کے رسم الخط کو ترقی دی گئی۔

سندھی زبان کا تاریخی پس منظر

برطانوی نوآبادکاروں کے دور میں پنجاب، سرحد اور بلوچستان میں اردو نے نیم سرکاری حیثیت حاصل کی۔ لیکن سندھ میں انیسویں صدی کے آخر میں سندھی کا سرکاری طور پر استعمال ہونے لگا۔ اسکولوں، ماتحت عدالتوں، بلدیات اور انتظامیہ کے مقامی اداروں میں سندھی رائج ہو چکی تھی۔ نیم سرکاری حیثیت ملنے سے سندھی زبان کو فروغ ہوا۔ پھلنے پھولنے اور ترقی کا موقع ملا۔ رسم الخط میں وقت اور معاشرے کی ضروریات کے مطابق ردو بدل اور اصلاحات ہوئیں۔ اخبارات اور جرائد نکلے۔ سندھی زبان ترقی پسند تحریک سے بھی متاثر ہوئی۔ ترقی پسند سندھی ادب تخلیق ہوا۔ صوبہ سندھ میں انگریزی کے ساتھ صرف سندھی رائج تھی۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ ریلوے اسٹیشنوں، دفاتر، مقامی اداروں اور تجارتی اداروں کے سائن بورڈ سندھی اور انگریزی میں لکھے جاتے تھے۔

قیام پاکستان کے بعد سندھ میں آباد ہونے والے جن مہاجرین نے حکومت سندھ کی ملازمت اختیار کی انہوں نے سندھی سیکھی۔ اندرون سندھ مہاجرین کے بچوں نے سندھی پڑھی۔ سابق ریاست خیرپور میں میٹرک تک سندھی بطور لازمی مضمون پڑھائی جاتی تھی۔ لیکن جب استحصالی طبقوں کی خوشنودی کے لئے حکمرانوں نے نہایت آمرانہ اور غیر جمہوری انداز میں ون یونٹ بنایا اور عوام کا نہایت بے رحمی سے استحصال شروع کیا تو اس کی ضرب سندھی زبان پر بھی پڑی۔ ریلوے اسٹیشنوں اور دفاتر سے سندھی کے سائن بورڈ ہٹا دیئے گئے۔ جن کی وجہ سے ان الفاظ کے معانی اور تاریخی پس منظر ختم ہو گیا۔ ستم بالائے ستم یہ کہ ایوب خان نے برسر اقتدار آنے کے بعد سندھی کو میٹرک تک ذریعۂ تعلیم سے گھٹا کر پرائمری تک کر دیا۔ بعد میں اس کی یہ حیثیت بھی ختم کرنے کی کوشش کی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ جب ایوبی آمریت کی برہنہ تلوار سندھی پر ضرب کاری لگا رہی تھی۔ اس وقت اردو کے "جن سنگھی دوست" نواب مظفر، ڈاکٹر آئی۔ ایچ۔ قریشی، جی۔ اے۔ مدنی اور حسین امام وغیرہ خوش ہو رہے تھے۔ نوکر شاہی ان کی پشت پناہی کر رہی تھی۔

سندھی کو دبانے، ختم اور پامال کرنے کی تمام تر کوششیں ناکام ثابت ہوئیں۔ کیونکہ اس کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ سندھ کے ہاریوں اور محنت کشوں کو اپنی زبان سے محبت تھی۔ وہ اسے سینے سے لگائے رہے۔ اس لئے یہ ترقی کی منازل طے کرتی رہی ویسے بھی زبانوں میں زبردست قوت مزاحمت ہوتی ہے۔ زبانوں کی قوت مزاحمت کے بارے میں کامریڈ اسٹالن کہتے ہیں۔

"تاریخ بتاتی ہے کہ زبانوں میں جبری پامالی کے خلاف مزاحمت کی زبردست قوت پائی جاتی ہے۔ بعض مورخ اس مظہر کی وضاحت کرنے کی بجائے اس پر حیرت و تعجب کے اظہار پر ہی اکتفا کرتے ہیں اس میں حیرانی کی کوئی وجہ نہیں۔ کیونکہ زبانوں کی زندگی



لسانی تنازعہ ایوب خان کا پیدا کردہ ہے

اور پائیداری کا سرچشمہ ان کا نظام صرف و نحو اور بنیادی ذخیرہ الفاظ ہیں۔ ترکوں نے سینکڑوں سال یک ریاست ہائے بلقان کے عوام کی زبانوں کو بگاڑنے اور مٹانے کی کوششیں کیں۔ اس دوران میں یا سہا بلقان کی زبان کی لغت میں کافی تبدیلی ہوئی۔ ان میں چند ایک ترکی الفاظ اور تراکیب شامل ہوئیں۔ متضادات و مترادفات کا ہنگامہ رہا لیکن بلقانی زبانوں نے سخت مزاحمت کی اور اپنی بقا کی جدوجہد میں کامیاب نکلیں۔ وجہ؟ یہی کہ ان کے نظام صرف و نحو اور بنیادی ذخیرہ الفاظ بڑی حد تک محفوظ رہے۔"

یہی بات سندھی زبان پر لاگو ہوتی ہے۔ ون یونٹ کے قیام کے بعد سندھی زبان کو دبایا گیا لیکن اس نے سخت مزاحمت کی۔ اپنی بقا کی جدوجہد میں کامیاب رہی۔ کیونکہ اس کے نظام صرف و نحو اور بنیادی ذخیرہ الفاظ محفوظ رہے۔

سندھ میں پیپلز پارٹی کی حکومت
کا قیام اور لسانی واقعات

حکومت سرحد، بلوچستان اور پنجاب نے اردو کو صوبائی زبان بنانے کا اعلان کیا۔ تو سوال پیدا ہوا کہ سندھ میں صوبائی زبان اردو ہوگی یا سندھی؟ دریں اثناء اردو اخبارات کے رویے کے پیش نظر سندھ میں اردو اخبارات کو جلانے اور اردو سائن بورڈ ہٹانے کے واقعات رونما ہوئے اور سندھی کو صوبائی زبان بنانے کا مطالبہ کیا جانے لگا۔ چنانچہ ۲۶ مئی کو صوبائی وزیر جناب عبدالوحید کٹپر نے سکھر میں کہا کہ "صوبہ سندھ کی سرکاری زبان سندھی ہوگی۔ صوبائی اسمبلی کے آئندہ اجلاس میں اس سلسلے میں ایک بل پیش کیا جائیگا اور پیپلز پارٹی کو اسمبلی میں اکثریت حاصل ہونے کی وجہ سے یہ بل یقینی طور پر منظور ہو جائے گا۔ سندھی کو سرکاری زبان قرار دینے سے اردو کی قومی حیثیت پر کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اردو اور سندھی میں درحقیقت کوئی ٹکراؤ نہیں ہے۔ دونوں زبانیں اپنی الگ الگ انفرادیت رکھتی ہیں...... اردو کے سائن بورڈوں کو تباہ کرنے سے اردو زبان تباہ نہیں ہو سکتی۔ اور نہ ہی اردو کے اخبارات کو نذر آتش کرنے اور اردو کے خلاف نعرے لگانے سے اردو زبان ختم ہو سکتی ہے۔ اسی طرح سندھ یونیورسٹی کی شعبہ سندھیالوجی کو جلانے سے سندھی ختم نہیں ہو سکتی ہے"

۲۹ مئی کو اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے گورنر جناب رسول بخش تالپور نے کہا کہ "زبان کے مسئلے پر ٹھنڈے دل اور معقولیت سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ انگریزی زبان کے سرکاری زبان ہونے پر کبھی کسی نے اعتراض نہیں کیا پھر سندھی زبان کے سرکاری ہونے پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے۔ اپنی زبانیں محبت کے اظہار کا ذریعہ ہوتی ہیں۔ منافرت پھیلانے کی نہیں، سندھی کو سرکاری زبان بنانے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔ کیونکہ ایوبی حکومت سے قبل سندھ میں سندھی سرکاری زبان تھی"۔ ۳۱ مئی کو جمعیت العلمائے پاکستان کراچی کے جنرل سیکرٹری محمد حسن، کونسل لیگ کے کونسلر عبدالمجید نیر، سابق ڈویژنل کونسلر خلیل غزنوی نے گورنر سندھ کے بیان پر نکتہ چینی کرتے ہوئے اردو کو بھی صوبے کی سرکاری زبان بنانے کا مطالبہ کیا۔ خلیل احمد غزنوی نے دھمکی دی کہ اگر یہ مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو کراچی کو علیحدہ صوبہ بنانے کی مہم شروع کر دی جائیگی۔

۲ جون کو صوبائی وزیر تعلیم جناب درمحمد اوستو نے ایک پریس کانفرنس میں یقین دلایا کہ سندھی کو صوبائی زبان بنانے سے اردو کا درجہ کم نہیں ہوگا۔ کیونکہ اردو قومی زبان ہے۔ اس لحاظ سے اس کا درجہ بے حد بلند ہے۔

اس یقین دہانی کے باوجود کہ اردو کی حیثیت متاثر نہیں ہو گی۔ ۳ جون کو پاکستان مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری سید ضیا عباس پاکستان جسٹس پارٹی کراچی کے جنرل سیکرٹری قاضی اعجاز احمد درانی پاکستان عوامی علماء پارٹی کے صدر مولانا ارشاد الحق تھانوی۔ انجمن ہائے متحدہ مشرقی پاکستان کے چیف کنوینر مشتاق احمد کی جانب سے ایک بیان داغا گیا جس میں سندھی کو صوبے کی واحد سرکاری زبان قرار دینے کی مذمت کرتے ہوئے اردو اور سندھی کو مشترکہ طور پر صوبائی زبان بنانے کا مطالبہ کیا گیا اور دھمکی دی گئی کہ بصورت دیگر کراچی کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک کا آغاز کر دیا جائے گا۔

۴ جون کو ٹنڈو آدم میں تقریر کرتے ہوئے وزیر اعلیٰ سندھ جناب ممتاز علی بھٹو نے کہا "سندھ کی سرکاری زبان صرف سندھی ہوگی۔ سندھی کی مخالفت کرنے والے سندھ کے غدار ہیں۔ سندھی کو آئینی طریقہ سے سرکاری زبان کی حیثیت دی جائے گی۔ انہوں نے نئے سندھیوں کو مشورہ دیا کہ وہ سندھی زبان سیکھیں اور خود کو سندھی تہذیب میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ جو شخص بھی سندھ میں رہتا ہے اُسے سندھ کی خلوص دل سے خدمت کرنی چاہیئے تاکہ سندھ کو ملک کے دوسرے ترقی یافتہ صوبوں کے برابر لایا جا سکے۔ انہوں نے کہا کہ سندھ میں رہنے والا کوئی شخص اتنا بے غیرت نہیں ہے کہ جئے سندھ کا نعرہ نہ لگائے اور سندھ کی خدمت نہ کرے جو شخص سندھ کا نمک کھاتا ہے اسے سندھ کی نمک حلالی کرنا پڑے گی۔ تاہم انہوں نے کہا کہ جئے سندھ کے نعرے کا غلط استعمال نہیں ہونا چاہیئے۔

وزیر اعلیٰ کی اس تقریر کا سخت ردعمل ہوا۔ کراچی اور حیدرآباد کی مختلف تنظیموں نے اس کے خلاف احتجاج کیا۔ ۶ جون کو ولی نیپ کے جنرل سیکرٹری محمود الحق عثمانی نے ایک اخباری بیان میں سندھ کو دو زبانوں کا صوبہ قرار دیا اور مطالبہ کیا کہ اردو اور سندھی دونوں کو سرکاری زبانوں کا درجہ دینا چاہیئے۔ صرف سندھی کو سرکاری درجہ دینا سندھ دشمنی کے مترادف ہوگا۔ کیونکہ کراچی کو دوبارہ سندھ سے علیحدہ کرنے کی راہ ہموار ہوگی۔ ۸ جون کو مولانا احتشام الحق تھانوی نے ایک اخباری بیان میں الزام لگایا کہ "سندھ کی پیپلز پارٹی اردو کو دیس نکالا دینے پر اصرار کر رہی ہے"۔

اردو محاذ کے کنوینر نواب مظفر حسین نے ۱۶ جون کو کراچی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے سندھ پیپلز پارٹی پر الزام لگایا کہ وہ زبان کے بارے میں اپنی پارٹی کی مرکزی کمیٹی کے فیصلہ کو جس میں اردو اور سندھی دونوں کو سندھ کی سرکاری زبان قرار دے دیا گیا۔ توڑنے، مروڑنے اور مسخ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ انہوں نے اردو کی حمایت میں تحریک چلانے کا اعلان بھی کیا۔

۱۸ جون کو سندھ متحدہ محاذ کے صدر جی ایم سید نے اپنی پارٹی کی ورکنگ کمیٹی سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ " برطانوی دور اقتدار کی مختصر مدت کے علاوہ سندھ دلیش پانچ ہزار سال سے قائم ہے۔ سندھی قومیت کو تسلیم کرنا سندھ کے عوام کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ اگر مہاجر چاہتے ہیں کہ وہ پاکستان میں رہیں جو انہیں دل و جان سے عزیز ہے تو انہیں سندھی قوم کے وجود کو تسلیم کرنا ہوگا۔ وہ لوگ جو بھارت سے آکر سندھ میں آباد ہوئے تھے، سندھی عوام کی زبان، تہذیب و تمدن کو تباہ کرنے اور ان کی معیشت پر قبضہ کرنے کی جان توڑ کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہ سندھیوں کو ریڈ انڈین بنا سکیں"۔

۱۹ جون کو پاکستان پیپلز پارٹی کی سنٹرل کمیٹی کے رکن نواب زادہ زاہد علی خان نے انکشاف کیا کہ

باقی صفحہ ۲۸ پر ملاحظہ فرمائیے

معراج محمد خان کی پیشینگوئی درست ثابت ہوئی



محنت

ہاریوں اور مزدوروں کی مشترکہ زبان

لوٹ کھسوٹ

سرمایہ داروں اور وڈیروں کی زبان



لسّانی تنازعہ — طبقاتی جدوجہد کیخلاف گہری سازش

نعیم الحسن

۳۰ جون کو کراچی کے ایک مقامی گرلز کالج میں وزیر مملکت برائے عوامی امور معراج محمد خان نے تقریر کرتے ہوئے کہا۔ "جب کوئی ملک تبدیلی سے گزرتا ہے تو ملک و قوم میں ایک ہیجانی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اگر گولی چلتی ہے یا کسان اپنے ظالم آقا کے خلاف اعلان بغاوت کرتا ہے۔ تو یہ اسی تبدیلی کی نشانی ہے ہمارا ملک بھی بعض تبدیلیوں سے گزر رہا ہے نوکر شاہی اور سرمایہ دار اس تبدیلی سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ استحصال کرنے والوں نے زبان کا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ زبان کی لڑائی سے صرف مزدور محنت کش اور مظلوم عوام کو نقصان پہنچے گا۔ کیونکہ وڈیروں، سرمایہ داروں کی زبان صرف استحصال اور لوٹ کھسوٹ کی زبان ہے۔ انہوں نے کراچی کے عوام اور طلباء سے اپیل کی کہ دشمن ہمیں زبان کے مسئلے میں الجھا کر کمزور کرنا چاہتا ہے اس لئے اگر کہیں سے اردو مردہ باد کا نعرہ بلند ہو تو اس پر توجہ دینے کی بجائے وہ سندھی، بلوچی پشتو، پنجابی اور قومی زبان اردو زندہ باد کا نعرہ لگائیں۔"

معراج محمد خان نے اپنی تقریر میں آنے والے حالات کی نشان دہی کر دی تھی۔ ان کی پیشین گوئی حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی۔ سندھی اور اردو زبان کی اگوائی کرنے والوں نے لسانی مسئلے کو کچھ اس انداز سے پیش کیا کہ وقتی طور پر منصفانہ حل کی راہیں مسدود ہو گئیں اور پورے سندھ میں لسانی منافرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق کیا گیا تھا۔ اس کے پیچھے استحصالی طبقے سے تعلق رکھنے والے وڈیروں، سرمایہ داروں اور نوکر شاہی کا ذہن کام کر رہا تھا۔ ایک ہی طبقے سے تعلق رکھنے والے محنت کشوں اور ہاریوں کو ایک دوسرے سے لڑا دیا گیا۔ بھائی بھائی کا مخالف بن گیا۔ ایک طرف "اردو مردہ باد" اور دوسری طرف "سندھی مردہ باد" کے مذموم نعروں سے سندھ کی صورت حال کو مزید بگاڑ دیا گیا۔ اس طرح وڈیروں، سرمایہ داروں اور ان کی ایجنٹ سیاسی پارٹیوں نے لسانی تعصب کے جذبات کو بھڑکا کر اس ملک کے مزدوروں اور کسانوں کی طبقاتی جدوجہد کے رخ کو ایک غلط سمت موڑنے کی ناکام کوشش کی۔

پیپلز پارٹی نے اپنے منشور کے مطابق محنت کش طبقے اور ہاریوں کے حالات زندگی میں انقلابی تبدیلی پیدا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ چنانچہ مزدوروں اور کسانوں کی بڑی تعداد پارٹی کی حمایت میں پیش پیش رہی۔ اس پاداش میں مزدوروں اور کسانوں کو بڑی بڑی سختیاں اٹھانی پڑیں۔ سرمایہ داروں اور جاگیرداروں

استحصالی طبقہ زبان کی آڑ میں خطرناک کھیل کھیل رہا ہے



ے انہیں انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا۔ ملوں اور کارخانوں سے مزدوروں کی بہت بڑی تعداد کو برطرف کر دیا گیا۔ اسی طرح ہاریوں کو ان کی اراضی سے بیدخل کیا گیا۔ استحصالی طبقے کی ان اشتعال انگیزیوں سے محنت کش عوام میں زبردست بے چینی اور بے اطمینانی پھیل رہی تھی۔ اسی دوران ملک میں سیاسی تبدیلی رونما ہوئی۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد یحییٰ خان کو اقتدار سے ہٹا دیا گیا اور پاکستان پیپلز پارٹی کو جو مغربی پاکستان کی سب سے بڑی اکثریتی پارٹی ہے اقتدار سونپ دیا گیا۔ اس سیاسی تبدیلی سے عوام نے اطمینان کا سانس لیا۔ مزدوروں اور ہاریوں نے سوچا اب ان کے دن پلٹنے والے ہیں۔ برطرف کئے جانے والے مزدوروں کو روزگار ملے گا اور بے دخل ہونے والے ہاریوں کو ہل چلانے کے لئے زمین مل جائے گی۔ لوٹ کھسوٹ اور استحصال کا خاتمہ ہوگا۔ نوکر شاہی عوام کی خدمت کے لئے ہوگی۔ لیکن اس سیاسی تبدیلی سے محنت کش عوام کی اقتصادی اور سماجی زندگی میں جب کوئی بڑی تبدیلی رونما نہ ہوئی تو ان کے اندر پلنے والی بے چینی اور بے اطمینانی پہلے سے دوچند ہو گئی۔ سرمایہ دار، جاگیردار، وڈیرے اور ان کے تنخواہ دار ایجنٹ عوام کے خلاف بدستور سازشوں میں مصروف رہے۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے کہ ناگزیر تبدیلیاں بھی پس پشت جا پڑیں۔ بے دخلی اور برطرفی کا سلسلہ جاری رہا۔ انہیں بدستور انتقامی کارروائیوں کا نشانہ بنایا جاتا رہا۔ عوام ان حالات سے مایوس ہو گئے۔ انہیں یقین ہو گیا کہ جب تک یہ نظام باقی رہے گا ان کے خلاف سازشیں ہوتی رہیں گی۔ استحصال کا بے رحم چکر چلتا رہے گا۔ سیاسی تبدیلیوں سے پیدا ہونے والی صورت حال نے محنت کش طبقے کو طبقاتی جدوجہد تیز کرنے پر مجبور کر دیا۔ شہروں میں مزدوروں اور دیہاتوں میں بے زمین ہاریوں نے استحصالی طبقے کے خلاف بھرپور جدوجہد شروع کر دی۔ کراچی، حیدرآباد اور کوٹری کے مزدوروں کی دس روزہ ہڑتال اور اس سے قبل ٹنڈو باگو، نواب شاہ اور میرپورخاص کی بعض اراضی پر کسانوں کے قبضے کی مہم سے سرمایہ دار اور جاگیردار بوکھلا اٹھے۔ سندھی زبان کے چیمپئن جی ایم سید تھا اور اردو زبان کے ٹھیکیدار نواب مظفر حسین دونوں پر لرزہ طاری ہو گیا کہ اگر محنت کش عوام کی طبقاتی جدوجہد ایسے تیور کے ساتھ جاری رہی تو ان کے طبقے سے تعلق رکھنے والے جاگیرداروں، وڈیروں اور نوابوں کے سیاسی تسلط اور اقتصادی غلبے کا خاتمہ ہو جائے گا۔ لسانی مسئلہ ان کا ایک خطرناک ہتھیار تھا۔ انہوں نے محنت کش عوام کی انقلابی جدوجہد کا رخ موڑنے کے لئے اس ہتھیار کو استعمال کیا۔ ایک طرف مٹھی بھر افراد نے "اردو مردہ باد" کے نعرے بلند کئے تو دوسری طرف کچھ لوگوں کے ذریعہ "سندھی مردہ باد" کے نعرے لگوا کر عوام میں اشتعال پھیلایا گیا۔ اسی دوران صوبائی اسمبلی میں لسانی بل پیش کیا



غریب اور مظلوم

عوام ہی

پکڑے جاتے ہیں

گیا۔ جس کا تاریخ وار یہاں ذکر ضروری ہے۔

۵ جولائی کو لسانی بل کا سرکاری مسودہ اسمبلی کے ارکان میں تقسیم کیا گیا۔ جس میں عبوری آئین کے تحت سندھی کو صوبے کی "صوبائی زبان" قرار دینے کی تجویز پیش کی گئی۔ اس بل پر ۷ جولائی کو صوبائی اسمبلی میں بحث ہونے والی تھی۔

۵ جولائی کی شام کو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کے مکان پر ایک پریس کانفرنس ہوئی جس میں اردو کے نمائندوں نے سخت اعتراض کیا اور اس بل کو اردو بولنے والوں کے حقوق پر ضرب کاری قرار دیا۔ ساتھ ہی اس بل کے خلاف ۸ جولائی کو پورے صوبے میں عام ہڑتال، احتجاج اور مظاہرے کا اعلان کر دیا گیا۔

۶ جولائی کو کراچی کے اخبارات میں حزب اختلاف اور اردو دان طبقے کے بعض نمائندوں کے بیانات شائع ہوئے۔ سرمایہ داروں کے بعض اخبارات نے اس صورتحال کو بگاڑنے کے لئے بیانات میں رنگ آمیزی بھی کی اور انتہائی اشتعال انگیز سرخیاں لگائیں۔ اسی دن کے اخبار میں یہ خبر بھی شائع کی گئی کہ اگر سندھی کے ساتھ اردو کو صوبے کی سرکاری زبان نہیں بنایا گیا تو کراچی کو علیحدہ صوبہ بنانے کی تحریک شروع کی جائے گی۔

۷ جولائی کو کراچی کے بعض اخبارات عجیب رنگ ڈھنگ سے شائع ہوئے۔ مقبوضہ اخبار جنگ نے سیاہ حاشیے میں "اردو کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے" کی سرخیاں لگائیں اس دن ہڑتال تھی اور اسی دن صوبائی اسمبلی میں زبان کا بل پیش ہونا تھا۔ زبان کے مسئلے کو اس طرح پیش کیا گیا کہ لوگوں کے جذبات مشتعل ہو گئے۔ عام ہڑتال کے دوران معمولی توڑ پھوڑ کے دو چار واقعات ہوئے۔ ۷ جولائی کو صوبائی اسمبلی نے بل منظور کر لیا۔ اپوزیشن والے واک آؤٹ کر گئے۔ منظور شدہ بل کے مطابق سندھی کو صوبے کی زبان کا درجہ دے دیا گیا۔ یہ بل اسلامی جمہوریہ پاکستان کے عبوری آئین کی دفعہ ۲۶۷ کی روشنی میں بنایا گیا۔ اس بل میں اردو کو مکمل تحفظ دیا گیا۔ اردو کی حیثیت بالکل متاثر نہیں ہوتی

۸ جولائی سے پورے کراچی میں ہنگامہ، توڑ پھوڑ اور تشدد کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی دن لیاقت آباد میں فائرنگ ہوئی جس سے کئی افراد ہلاک ہو گئے۔ شہری زندگی مفلوج ہو گئی۔ جذبات کو اس قدر مشتعل کر دیا گیا کہ لوگ "سندھی اردو مردہ باد" کے نعرے لگاتے ہوئے ایک دوسرے سے بھڑ گئے۔ نئی کراچی میں سندھیوں کی دکانوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا۔ جہانگیر روڈ پر ٹرکوں کو جلا دیا گیا۔ جھگیوں کو آگ لگا دی گئی۔ اس کے جواب میں اندرون سندھ چند جگہوں میں اردو بولنے والوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ بھائی بھائی کا دشمن بن گیا۔ مزدور کو مزدور کا خون بہانے، ہاری کو ہاری کا دشمن بنانے کی مذموم کوششیں کی گئیں لیکن وہ اس فریب میں نہیں آئے۔ کراچی کے مزدوروں نے رجعت پسندوں کی اس عوام دشمن تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ انقلابی مزدوروں کی بستیوں پٹھان کالونی اور فرنٹیر کالونی میں یہ تحریک داخل نہیں

ہو سکی۔ ان ہی دنوں روزنامہ حریت کیمطابق انقلابی ہاریوں نے ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خاں کی زرعی اراضی پر قبضہ کر لیا۔

سرمایہ داروں اور جاگیرداروں نے طبقاتی جد و جہد کے رخ کو موڑنے کی جو گھناؤنی سازش تیار کی تھی۔ اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہو گئے۔ ایک ہی طبقے سے تعلق رکھنے والے مزدوروں اور کسانوں کے درمیان لسانی تنازعہ کھڑا کر دیا گیا۔ معراج محمد خان نے صحیح کہا تھا کہ

"استحصال کرنے والوں نے زبان کا مسئلہ کھڑا کیا ہے۔ زبان کی لڑائی سے محنت کش عوام، مزدور اور مظلوم عوام کو نقصان پہنچے گا۔"

استحصالی طبقے نے زبان کے سیدھے سادے مسئلے کو لسانی منافرت میں تبدیل کر کے وقتی طور پر عوامی اتحاد کو کمزور کر دیا۔ طبقاتی جد و جہد کے ذریعہ شہروں اور دیہاتوں، مزدوروں اور ہاریوں سے جو رشتہ قائم ہو رہا تھا۔ اسے عوام دشمن لسانی تنازعہ کے ذریعہ کمزور کرنے میں کسی حد تک کامیاب ہو گئے۔ ملک کی تاریخ موجود ہے۔ جب کبھی طبقاتی جد و جہد آگے بڑھی، تیز ہوئی۔ مزدوروں اور کسانوں میں اتحاد پیدا ہوا۔ محنت کش عوام اپنے وسیع تر مفاد کے لئے ایک پلیٹ فارم پر یکجا ہوئے۔ ان کے درمیان بے معنی مسئلہ کھڑا کر کے ان کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ آج بھی مزدور کو مزدور سے اور ہاری کو ہاری سے لڑانے کے لئے لسانی تنازعہ پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن یہ وقتی چیز ہے۔ جب جذبات ٹھنڈے ہوں گے تو لوگ اپنے اصل دشمن کو شناخت کرنے میں دیر نہیں لگائیں گے۔ اور پھر ان کا اتحاد، ان کی طبقاتی جد و جہد ان کے سیاسی اور اقتصادی اقتدار الٹ کر رکھ دے گی۔

صوبائی اسمبلی سندھ

لسانی بل سنہ ۱۹۷۲ء

(سندھی زبان کی تعلیم، فروغ اور استعمال کا بل مجریہ سنہ ۱۹۷۲ء)

تمہید

ہرگاہ کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے عبوری آئین میں دفعہ ۲۶۷ کے تحت ایک صوبائی مجلس قانون ساز قومی زبان کی حیثیت کو متاثر کئے بغیر قانوناً ایسے اقدام کر سکتی ہے۔ جس کے تحت قومی زبان کے علاوہ صوبائی زبان میں بھی تعلیم دی جا سکے اور اس کے فروغ اور استعمال کے لئے اقدامات کئے جائیں گے۔

اور ہرگاہ کہ سندھی زبان حکومت سندھ کے محکموں اور دفتروں میں مستعمل ہے اور ہرگاہ کہ سندھی زبان تعلیمی اداروں میں لازمی مضمون کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن ازاں بعد مارشل لاء حکام کے زبانی احکامات کی وجہ سے اسے ختم کر دیا گیا اور ہرگاہ کہ سندھ کے باشندوں کا فطری جذبہ اور خواہش ہے کہ سندھی زبان میں تعلیم دی جائے اور اس کے استعمال کو فروغ دیا جائے لہذا مندرجہ ذیل قانون کی تشکیل کی جاتی ہے۔

(۱) مختصر نام، آغاز اور وسعت اطلاق

(۱) یہ قانون (سندھ میں تعلیم، فروغ اور سندھی زبان کے استعمال کا) قانون مجریہ ۱۹۷۲ء کہلائے گا۔

(۲) اس قانون کا صوبہ سندھ میں فوری نفاذ ہو گا اور اس کا اطلاق پورے صوبہ سندھ پر ہو گا۔

(۲) تعریف

اس ایکٹ میں مندرجہ ذیل الفاظ کے معنی و مطالب علی الترتیب مستعملہ ہیں۔ ماسوا کہ سیاق و سباق کی تفہیم کے لئے مستعمل ہوں۔

(الف) "اسمبلی"۔ بہ معنی صوبائی اسمبلی سندھ

(ب) "گورنمنٹ" بہ معنی حکومت سندھ

(ج) "ڈیپارٹمنٹ آف گورنمنٹ"۔ بہ معنی حکومت کا کوئی محکمہ بشمول خود مختار ادارہ لوکل کونسل یا لوکل اتھارٹی۔

(د) "انسٹی ٹیوشن" بہ معنی اسکول، کالج، یونیورسٹی یا کوئی اور تعلیمی ادارہ

(۳) صوبائی زبان

سندھی صوبہ کی صوبائی زبان کی حیثیت سے استعمال کی جائے گی۔

(۴) سندھی کی تعلیم

(۱) سندھی اور اردو کو چوتھی جماعت سے بارہویں جماعت تک ان تمام اداروں میں جہاں ان کی کلاسیں ہوتی ہیں لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے گی۔

(۲) سندھی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے پچھلے درجہ یعنی چوتھی جماعت سے لازمی کیا جائے گا اور بتدریج بارہویں جماعت تک نافذ و رائج کیا جائے گا۔

(۵) سندھی زبان کا فروغ

حکومت سندھی زبان کے ثقافتی فروغ و ترقی کے لئے اکیڈمیز اور بورڈ قائم کر سکتی ہے۔

(۶) سندھی کا استعمال

عبوری آئین کی دفعات کو مد نظر رکھتے ہوئے حکومت سرکاری محکموں دفاتر بشمول عدالتوں اور اسمبلی میں سندھی زبان کے ترقی پسندانہ استعمال کے لئے انتظامات کر سکتی ہے۔

(۷) قواعد وضع کرنے کا اختیار

(۱) اس قانون کے مقاصد کی تکمیل کے لئے حکومت قواعد وضع کر سکتی ہے۔

(۲) خاص طور پر ایسے قواعد جو ان مقاصد کے لئے ہوں

(الف) سندھی زبان کو بتدریج تعلیم کیلئے لازمی مضمون بنانا۔

(ب) اکیڈمی اور بورڈ بنانا اور ان کے اختیارات اور کام کا تعین کرنا۔

(ج) سندھی زبان کو سرکاری محکموں، دفاتر، اسمبلی عدالتوں اور اداروں وغیرہ میں بتدریج رائج کرنا۔

اغراض و مقاصد

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے عبوری آئین کی دفعہ ۲۶۷ میں کہا گیا ہے کہ قومی زبان کی حیثیت کو متاثر کئے بغیر صوبائی اسمبلی قومی زبان کے علاوہ ایک صوبائی زبان کی تعلیم فروغ اور استعمال کے لئے قانون بنا سکتی ہے۔ صوبہ سندھ کی یہ فطری امنگ اور خواہش ہے کہ حکومت کے محکموں کا کام سندھی زبان میں کیا جائے۔ فی الوقت حکومت کے بیشتر محکموں میں سندھی زبان میں خط و کتابت اور کام ہوتا ہے۔ اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ حکومت سندھی زبان کی تعلیم اور استعمال کے اختیارات ہوں۔ یہ اختیارات بہرحال اردو کے استعمال کو متاثر کئے بغیر ہوں گے۔

پروفیسر فضل حسین صمیم

میری پہچان بہت آساں ہے

میری پہچان بہت آساں ہے
وقت پرویز ہو جائے تو جوئے شیریں
دستِ فرہاد سے فرہاد کی جاں مانگتی ہے
وقت جب جہل کی کالی چادر
اوڑھ لیتا ہے تو بھائی کے لئے بھائی بھی
ایسے زنداں کی تمنّا میں نکلتا ہے جہاں
اندھی آنکھوں سے بھی بڑھ کر اندھیرے کا وجود
میری آواز وہاں گونجتی ہے
میری پہچان بہت آساں ہے

شعلۂ آتشِ نمرود کی زہریلی زباں
جب کسی سچے پیغمبر کی صداقت کے عوض
بڑھ کے انگشتِ گواہی پہ جو ڈس لیتی ہے
دیدۂ جبر کا تب سنگِ سیاہ دیکھتا ہے
آگ گلزار کی صورت میں پگھل جاتی ہے۔
میرا احساس وہاں جاگتا ہے
میری پہچان بہت آساں ہے

پشت در پشت اٹھائے ہوئے اس زیست کا بوجھ
اپنے ہی قدموں پہ گرتا ہے جو مزدور کوئی
کوئی مجبور جو شہ رگ کا لہو بیچتا ہے
کوئی کرگس کسی مظلوم کو جب نوچتا ہے
کوئی مقہور کسی قہر سے جب کانپتا ہے
تب میاں سے میری تلوار نکل آتی ہے
میری پہچان بہت آساں ہے

خالقِ خوشہ کوئی پیٹ پہ پتھر باندھے
سال ہا سال سے اِک نانِ جویں مانگتا ہے
قرن ہا قرن کی جب تشنہ زمین
سوئے افلاک بہ اندازِ دعا دیکھتی ہے
تب کوئی ابرِ کرم کھل کے برستا ہے تو میں
صورتِ قوسِ قزح، سرخ و سیاہ سبز رداء اوڑھے ہوئے ہوتی ہیں
میری پہچان بہت آساں ہے



لانگ مارچ کے دوران
صدر ماؤ کے ساتھ ۔ ۵

چھن چھانگ فنگ
ترجمہ: احفاظ الرحمٰن

صدر ماؤ نے پُر عزم لہجے میں کہا:۔

"مشکلات سے خائف نہیں ہونا چاہیئے"

میں بُری طرح ملیریا میں مبتلا ہو گیا۔ جیا چھن پہاڑ کو پار کرنے سے پہلے میرا اس سے واسطہ پڑ چکا تھا۔ لیکن اسے پار کرتے وقت اس کا کوئی حملہ نہیں ہوا تھا۔ پھر میں بارش میں بھیگتا رہا اور اب جب کہ میں سفر کی تھکن سے چور چور ہو چکا تھا۔ مجھ پر اِس کا شدید حملہ ہو گیا۔ ایک ایسے وقت جب کہ ہم اپنے راستے کی سب سے بڑی رکاوٹوں میں سے ایک رکاوٹ خطرناک دلدلوں سے پُر گھاس کے میدان کو عبور کرنے والے تھے۔ ایسے وقت بیمار پڑنا صرف اپنی ذات کے لئے بدقسمتی کی بات نہیں تھی۔ مجھے اس بات کا احساس تھا کہ میں اپنے تمام کامریڈوں اور خاص طور پر صدر ماؤ کے لئے بوجھ بن جاؤں گا اور اُن کے پریشانی کا باعث بنوں گا۔ وہ خود بھی پہلے سے زیادہ کمزور ہو گئے تھے اور اب اُن کا چھریرا جسم پہلے سے کہیں زیادہ لمبا دکھائی دیتا تھا۔

اس دوران وہ بار بار میٹنگوں میں شرکت کرتے رہے تھے بعض اوقات یہ میٹنگیں رات گئے تک جاری رہتیں، جس کے بعد وہ ذرا سا بھی آرام کئے بغیر رہنما کامریڈوں سے بحث و تمحیص میں مصروف ہو جاتے، جس کا سلسلہ صبح تک جاری رہتا۔ وہ بہت مصروف رہتے تھے لیکن اس کے باوجود اکثر میری عیادت کے لیے آتے رہتے تھے۔ جب وہ دیکھتے تھے کہ میں پریشان ہوں تو وہ اس بات کی وضاحت کر کے میرے حوصلوں کو بلند کر دیتے کہ ہمیں گھاس کے ان میدانوں کو کیوں پار کرنا ہے۔ اور اپنی دلچسپ کہانیاں سنا کر میرے اندر ایک نئی روح پھونک دیتے۔

میں ان کے اندر ایک باپ کی شفقت محسوس کرتا تھا میرے دِل میں ان کے لیے تشکر اور ممنونیت کے گہرے جذبات موجود تھے۔ میں خود کو بُری طرح کوسنے لگتا تھا۔ آخر میں ایسے موقع پر بیمار کیوں ہُوا؟ میں نے اپنے کامریڈوں کے بوجھ میں اضافہ کر دیا تھا اور صدر ماؤ کے لیے پریشانی کا باعث بن گیا تھا۔

اس سے پہلے کسی انسان نے اس علاقے میں قدم نہیں رکھا تھا

ہم نے ماؤ ارڑکھائی میں تقریباً ایک ماہ قیام کیا۔ اگست ۱۹۳۵ء کے وسط میں ہم اس بڑے گھاس کے میدان کی طرف روانہ ہوئے جہاں کبھی کسی انسان نے اپنے قدم نہیں رکھے تھے۔ ابھی ہم مشکل ۴۰ "لی" دور گئے ہوں گے کہ ایک قدیم اور وسیع جنگل نے ہمارا راستہ روک لیا۔ اس کے موٹے موٹے تنوں والے درختوں کی شاخیں ہمارے سروں کے اوپر لہرا رہی تھیں۔ جب ہم رات کو کہیں قیام کرتے تھے تو صدر ماؤ کے جھولے نما بستر کو دو درختوں سے باندھ دیا جاتا، لیکن وہ شاذ و نادر ہی اس پر آرام کرتے تھے۔ وہ میٹنگوں میں شرکت کرتے یا لوگوں سے ملاقات کرنے کے لیے چلے جاتے۔ چنانچہ ان کا طبی اردلی چھونگ فوچھانگ مجھے اس پر لیٹنے کی اجازت دے دیتا۔

ایک رات میں ان کے بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ ہماری فوج نے جگہ جگہ الاؤ روشن کر رکھے تھے۔ اس قدیم جنگل کے پرندوں اور چرندوں نے غالباً اس سے پہلے آگ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ دہشت زدہ ہو گئے۔ اور عجیب و غریب آوازیں نکالتے ہوئے وہاں سے بھاگ نکلے یا دہشت کے عالم میں ہمارے گرد منڈلانے لگے۔ میرے کامریڈ قریب ہی ایک الاؤ کے گرد سوئے پڑے تھے۔

میں نے صدر ماؤ کا کمبل اوڑھ رکھا تھا اور کپڑوں کا ایک نیا جوڑا پہن رکھا تھا جو انہوں نے ماؤ ارڑکھائی میں مجھے دیا تھا، اس کے باوجود اچانک مجھ پر ناقابلِ برداشت کپکپی طاری ہو گئی۔ میرا جسم بری طرح کانپ رہا تھا لیکن میں نے سوچ لیا تھا کہ منہ سے کوئی آواز نہیں نکالوں گا تاکہ دوسروں کی نیند میں خلل نہ واقع ہو۔ خاص طور پر مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ اس طرح طبی اردلی چھونگ فوچھانگ جاگ جائے گا۔ اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ مجھ پر ملیریا کا حملہ ہو گیا ہے تو وہ فوراً صدر ماؤ کو اس کی اطلاع پہنچا دیتا اور پھر وہ اپنا جھولا نما بستر استعمال کرنے سے انکار کر دیتے۔ میں نے اپنا سانس روک لیا اور گھٹنے سکیڑ لیے جو میری ٹھوڑی کو چھونے لگے، اور خاموشی سے پڑا رہا۔ اچانک سامنے ایک لمبا سا سایہ نظر آیا، صدر ماؤ واپس آ گئے تھے! میں نے اپنی ٹانگیں سیدھی کرنے کی کوشش کی لیکن وہ تو جیسے بے جان ہو چکی تھیں۔ مجھے اپنے جسم پر قابو نہ رہا اور میرے دانت بجنے لگے۔ میرا جسم اس طرح لرز رہا تھا جیسے مجھ پر کوئی دورہ پڑ گیا ہو۔ صدر ماؤ بستر کے قریب پہنچ کر میرے اوپر جھکے!

"چھن چھانگ فنگ کیا بات ہے؟" انہوں نے اپنا ہاتھ میرے جسم پر رکھا اور چلّا پڑے— "چھونگ فوچھانگ، چھن چھانگ فنگ پھر بیمار ہو گیا ہے!!"
ان کی آواز زیادہ بلند نہیں تھی، لیکن الاؤ کے گرد سوئے ہوئے سب لوگ جاگ گئے اور میرے گرد جمع ہو گئے۔

جب میں نے دیکھا کہ صدر ماؤ اور میرے گرد کھڑے ہوئے دوسرے کامریڈ میرے لیے اس قدر فکرمند ہیں تو میرے جسم میں ایک نئی قوت عود کر آئی اور میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"لیٹ جاؤ" صدر ماؤ نے بڑی شفقت سے مجھے حکم دیا اور اپنے دونوں ہاتھوں سے مجھے بستر کی طرف دھکیلنے لگے۔ میں نے بیٹھے رہنے کی بہت کوشش کی لیکن ان قوی ہاتھوں نے مجھے بستر میں دھکیل دیا اور مجھ میں مدافعت کی تاب نہ رہی۔ جب میں سکون سے لیٹ گیا تو انہوں نے چھونگ فوچھانگ سے کہا کہ وہ مجھے کچھ دوا دیدے۔ پھر وہ اور دوسرے کامریڈ سونے کے لیے الاؤ کی طرف چلے گئے۔

صبح جب آنکھ کھلی تو میں اچھل کر بستر سے نیچے اترا۔ نہ معلوم مجھ میں اتنی قوت کہاں سے آ گئی تھی۔ شاید رات کی پرسکون نیند کی وجہ سے یا صدر ماؤ کی پدرانہ شفقت کے تاثر کی وجہ سے۔ میں نے اٹھتے ہی سب سے پہلا کام یہ کیا کہ صدر ماؤ سے ملنے کے لیے لپکا۔

"کیا تمہاری طبیعت پہلے سے بہتر ہے؟" انہوں نے اپنا ہاتھ میرے بازو پر رکھتے ہوئے پوچھا۔

میرے منہ سے ایک لفظ تک نہ نکل سکا میری آنکھیں بھر آئیں۔

ہم نے ایک بار پھر اپنا سفر شروع کر دیا۔ بوڑھا جنگل پیچھے رہ گیا تھا اور ہم گھاس کے میدان میں داخل ہو چکے تھے۔ ایک وسیع اور ویران دلدلی خطہ ہمارے سامنے پھیلا ہوا تھا، وہاں ایک بھی انسان اور ایک بھی مکان نظر نہیں آتا تھا۔ ٹھہرے ہوئے پانی میں کثرت سے گھاس اگی ہوئی تھی۔ ہمیں چلنے میں بڑی دقت محسوس ہو رہی تھی اور ہمارے قدموں کے نیچے کیچڑ سے پچ پچ کی ناخوشگوار آواز نکل رہی تھی۔ بے احتیاطی سے اٹھایا ہوا کوئی بھی قدم ہم کو دلدل کی گہرائیوں میں دفن کرنے کے لیے کافی تھا۔ یا کم از کم ہمارے پاؤں کو دلدل میں پھنسا سکتا تھا اگر کوئی شخص اس میں پھنس جاتا تو اس کے لیے دوسرے کامریڈوں کی مدد کے بغیر اس سے نکلنا ناممکن ہوتا۔ ایسے موقعوں پر کئی دفعہ خود صدر ماؤ نے ہم میں سے بعض کو اپنے مضبوط ہاتھوں کا سہارا دیا۔

موسم سرد تھا اور ہر آن نیا رنگ بدل رہا تھا۔ ابھی بارش ہو رہی ہے تو ابھی برفباری بھی ہونے لگی۔ بعض اوقات ژالہ باری تک ہونے لگتی۔ ہر قدم ایک نئی جدوجہد کا پیامبر تھا۔ صدر ماؤ ہمارے آگے آگے چل رہے تھے۔ وہ بار بار لمحے بھر کے لیے رک کر ہماری طرف دیکھ لیتے، باری باری سب کے نام پکارتے اور جب ہم میں سے ہر ایک کا جواب مل جاتا تب کہیں آگے بڑھتے۔ بعض اوقات جب وہ یہ دیکھتے کہ ہم کچھ بجھے بجھے سے ہیں تو وہ ہمیں کہانیاں اور لطیفے سناتے جنہیں سن کر ہم لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ اور ہمیں تھکن کا احساس تک نہ رہتا۔

کسی شخص کے منہ پر شکایت کا ایک حرف تک نہیں آیا۔ ہم اس منزل کو سر کرنے کا عزم کر چکے تھے۔ اور ہمیں یقین تھا کہ ہم اس میں ضرور کامیاب ہوں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب صدر ماؤ ہمارے ساتھ ہوتے تھے تو ہم ہمیشہ پُراعتماد رہتے تھے۔

ہماری فوج بھی گھاس کے اس میدان میں داخل ہو چکی تھی۔ سپاہیوں نے مختلف رنگوں کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ بعض نے مٹیالے رنگ کی وردیاں پہن رکھی تھیں۔ اور مختلف قسم کی کھالوں کے لمبے لمبے کوٹ پہن رکھے تھے اور بعض نے کمبل اوڑھ رکھے تھے، بعض نے بانس کے بنے ہوئے گول ہیٹ پہن رکھے تھے اور ٹوٹی پھوٹی چھتریاں اٹھائے ہوئے تھے۔ لیکن اس خستہ حال قافلے نے اس ویران دلدلی علاقے میں زندگی کی روح پھونک دی تھی۔ وہ لمبی قطاروں میں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے۔ ان کی رفتار آہستہ تھی لیکن ان کی مستقل مزاجی میں کوئی فرق نہیں آیا۔

ایک دن اچانک ہمیں سامنے ویران افق پر ایک سیاہ سا دھبّہ نظر آیا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھتے گئے اس کا حجم بھی بڑھتا گیا۔ یہ دیکھ کر ہمارے جوش و خروش میں اضافہ ہو گیا۔ ہمارے دلوں میں آرزو کی کرن جگمگا اٹھی

ہر قدم ایک نئی جدوجہد کا پیامبر تھا

یہ یا نیو کا مقام تھا۔ ہم لوگوں کے احساسات کا کیا عالم تھا میں اسے الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ یہاں پہنچ کر ہم محافظوں اور صدر ماؤ نے ایک تبتّی کے گھر میں قیام کیا۔ ہمارے تمام ساتھی بہت مسرور تھے۔ ہم نے اُپلے جلا کر ان پر اپنے گیلے اور پھپھوندی لگے کپڑوں کو خشک کیا ——!

کچھ ہی عرصہ بعد ہم پاہشی پہنچ گئے۔ جہاں ہم نے ایک منظر دیکھا۔ چوتھی فرنٹ آرمی کے کچھ سپاہی بڑی بددلی سے بوجھل قدموں کے ساتھ ہماری مخالف سمت میں گھاس کے میدان کی طرف جا رہے تھے۔ ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ جب ہم نے صدر ماؤ سے دریافت کیا تو انہوں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ لیکن ان کے چہرے کے تاثرات کہہ رہے تھے۔ کہ انہیں بہت دُکھ پہنچا ہے۔ پھر انہوں نے ہمیں بتایا کہ یہ چانگ کو تھاؤ کی کارستانی ہے جو پارٹی میں پھوٹ ڈالنے کی سازش کر رہا ہے۔ وہ ان سیدھے سادے کامریڈوں کو کسی ظالم جلّاد کی طرح تباہی کے راستہ کی طرف ہانک کرلے جا رہا تھا۔

لمحے بھر کے سکوت کے بعد انہوں نے ہم سے پوچھا۔

"کیا تم لوگ بھی واپس جانا چاہتے ہو اور دوبارہ گھاس کا میدان عبور کرنا چاہتے ہو؟"

"کبھی نہیں، ہم اس پر موت کو ترجیح دیں گے!" ہم نے ایک زبان ہو کر جواب دیا۔

صدر ماؤ کھڑے ہو کر ان نڈھال، خستہ حال لوگوں کی طرف دیکھنے لگے جو وہیں واپس جا رہے تھے، جہاں سے وہ گزر کر آئے تھے۔ انہوں نے مدھم لیکن پُراعتماد لہجے میں کہا —— "یہ لوگ ضرور واپس آئیں گے۔ ہمیں ان کے لیے آگے کا راستہ صاف رکھنا چاہیئے تاکہ وہ ہمارے پاس آسکیں!"

لیوپان پہاڑ پر

ستمبر کے وسط میں ایک دن جھٹ پٹے کے وقت ہم ایک گاؤں میں پہنچے جو لت شی کو سے بہت قریب تھا میں نے وہاں صدر ماؤ کا خشک گھاس سے بھرا ہوا گدّا بچھا دیا تاکہ وہ وہاں تھوڑا آرام کرلیں۔ لیکن جب میں اگلے کمرے کی طرف بڑھا تو دیکھا کہ وہ پہلے ہی نیتہ زونگ چھن، لیو پالو اور دوسرے کامریڈ رہنماؤں کے ساتھ میٹنگ میں مصروف ہیں۔ ان کی میز نقشوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔

لت شی کو اسٹریٹجی کے اعتبار سے ایک اہم درّہ ہے جو دو صوبوں سچھوان اور کانسو کو ایک دوسرے سے ملاتا ہے۔ شمالی شینسی کے سفر میں یہ ہمارے راستے کا سب سے بڑا درّہ تھا۔ میں سمجھ گیا کہ صدر ماؤ اور دوسرے رہنما اسی نکتے پر بحث کر رہے ہیں۔ چنانچہ میں ایک لفظ بھی کہے بغیر چپکے سے واپس آگیا۔ اس روز صدر ماؤ رات گئے تک جاگتے رہے۔

اگلے دن ہم نے صبح سویرے اس درّے پر دھاوا بول دیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد ہم وہاں نہیں رُکے بلکہ آگے بڑھتے رہے۔

ستمبر کے اواخر میں ہم نے دریائے ولیشوئے کی ناکہ بندی لائن کو پار کر لیا اور لیوپان پہاڑ کی طرف بڑھنے لگے۔

کوہ لیوپان لنگ شان سلسلۂ کوہ میں واقع ہے اور مغربی کانسو کا سب سے بڑا پہاڑ ہے۔ شمالی شینسی کے سفر میں یہ ہماری راہ میں آنے والا آخری بڑا پہاڑ تھا جب لوگوں نے یہ سُنا کہ ہم اس پہاڑ کو عبور کرنے والے ہیں تو ان کے حوصلے بلند ہو گئے۔ جس دن ہم

بوڑھے جنگل سے نکل کر

ہم گھاس کے

خطرناک میدان میں

داخل ہو گئے

پہاڑ کی طرف روانہ ہوئے آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے اور سرد ہوائیں چل رہی تھیں۔ تھوڑی ہی دیر بعد بارش ہونے لگی۔ پہاڑ کے دامن تک پہنچتے پہنچتے ہم پانی میں شرابور ہو چکے تھے۔ لیکن ہمارے عزم میں کوئی فرق نہیں آیا۔

کوہ لیوپان برفپوش پہاڑ چھیا چھن کے مقابلے میں جسے ہم پہلے پار کر آئے تھے، کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا لیکن جب ہم نے اس پر قدم رکھا اور اوپر چڑھنے لگے تو محسوس ہوا کہ یہ پہاڑ خاصا پُرخطر ہے۔ پہاڑی راستہ پیچ و خم کھاتا ہوا گزرتا تھا۔ شروع میں تو وہاں چھوٹے چھوٹے پودے موجود تھے جن کا سہارا لیا جا سکتا تھا۔ لیکن جوں جوں ہم چوٹی کے قریب پہنچتے گئے، ان کا نشان ختم ہوتا گیا اور وہاں صرف سوکھی گھاس کے ٹنڈ رہ گئے۔ راستہ بڑا دشوار گزار تھا۔

میں ملیریا کے سبب خاصی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ دامن سے چوٹی تک کا راستہ تیس لی لمبا تھا اور بہت ناہموار تھا۔ ابھی ہم نے آدھا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ میرا سانس بری طرح پھولنے لگا۔ میرا دل بری طرح دھڑک رہا تھا اور میں پسینے میں ڈوب گیا تھا۔

صدر ماؤ نے فوراً بھانپ لیا۔ جب کبھی، ہم کسی دشوار گزار خطے میں پہنچتے تو وہ اپنا لمبا، مضبوط ہاتھ آگے بڑھا کر مجھے اوپر کی طرف کھینچ لیتے۔ جب ہم چوٹی کے قریب پہنچے تو مجھ میں ایک قدم بھی چلنے کی سکت نہ رہی۔ میرا سَر گھومنے لگا۔ ایسا محسوس ہوا۔ جیسے میرا جسم ہوا میں تیر رہا ہو اور میں اچانک کٹے ہوئے درخت کی طرح نیچے گر پڑا۔

مجھے یوں محسوس ہوا۔ جیسے دو لمبے لمبے ہاتھ مجھے سہارا دے کر کھڑا کرنے کی کوشش کر رہے ہوں میں نے سنا صدر ماؤ بڑے نرم لہجے میں ثینگ سے کہہ رہے ہیں —— "طبی اردلی کو بلا لاؤ کہ وہ فوری طور پر اسے کچھ دوا دے دے، اس پر پھر ملیریا کا حملہ ہو گیا ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد کسی نے دو کڑوی گولیاں میرے مُنہ میں ڈال دیں اور مجھے پانی پلایا۔ دھیرے دھیرے میری قوت بحال ہونے لگی۔ صدر ماؤ مجھے اپنے بازوؤں کا سہارا دیئے ہوئے تھے اور ثینگ اور طبی اردلی میری طرف دیکھ رہے تھے۔ میرا دِل ڈوب رہا تھا ——!

(باقی آئندہ)



اس نوجوان کو ۱۲ سال کی عمر میں گرفتار کر کے بیبر کیمپ میں ڈال دیا گیا



سورا بایا کا پیٹی کلرک

فرار ہونے والے دو انڈونیشی نوجوانوں کا جسم چھل

"۱۹۶۵ء میں بائیں بازو کے ناکام انقلاب کے بعد انڈونیشیا میں محبِ وطن اور بائیں بازو کی سوچ رکھنے والے عناصر کے خلاف نفرت کی ایک ایسی مہم شروع کی گئی جس میں لاکھوں بےگناہ انسانوں کو انتہائی وحشیانہ طریقہ سے ہلاک کر دیا گیا اور جو دستِ قاتل سے بچ گئے انہیں انڈونیشیا کے مختلف جزائر میں حیوان بنا کر قید کر دیا گیا۔ یہ قیدی چھوٹی بڑی بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم رکھے گئے ہیں۔ انہیں صرف اتنا دیا جاتا ہے جس سے وہ ۲۴ گھنٹے زندہ رہ سکیں ——— یہ فیچر انڈونیشیا کے ایک جزیرے "برو" کے قیدیوں کے حالاتِ زندگی پر تیار کیا گیا ہے۔ انسان سے انسان کی نفرت کی یہ کہانی ہولناک اور لرزہ خیز ہے !!! "

یہ دسمبر ۱۹۶۹ء ہے۔ جزیرہ "برو" جنگلوں، پہاڑوں، کھاڑیوں اور دلدلی علاقوں سے گھرا ہوا ہے۔ پہاڑیاں سفید دھوئیں سے لپٹی ہوئی ہیں اور اس کے نیچے گدلے گہرے اور سبز پانیوں کے اوپر کہر کی دبیز چادر گری ہوئی ہے ہر طرف ایک پُرہول سناٹا ہے۔ چشمے سے کچھ دور ایک وسیع علاقے کو خاردار تاروں سے گھیر دیا گیا ہے اور اس کے اندر چھوٹی بڑی لاتعداد جھونپڑیاں پھیلی ہیں۔

ایک جھونپڑی کا دروازہ آہستگی سے کھلتا ہے اور دو انڈونیشی نوجوان بڑی احتیاط اور خاموشی سے نکل کر یہاں سے فرار ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ ابھی مشکل سے انہوں نے تین چار فرلانگ کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ ایک چوکی سے وارننگ دیئے بغیر فائرنگ شروع کر دی جاتی ہے۔ مشین گن کی گولیاں ان کے جسم کو چھلنی کر دیتی ہیں مگر جب تک ان کے جسم میں بھاگنے کی سکت ہوتی ہے، وہ بھاگتے رہتے ہیں، مگر کہاں تک ——— اور کب تک ———؟ گولیوں کی باڑ انہیں اچھال کر خاردار تاروں پر پھینک دیتی ہے اور ان کا جسم قید سے رہائی کی آخری امید میں تڑپ تڑپ کر بے رحم خاردار تاروں میں الجھ کر ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔

فائرنگ کرنے والے فوجی آپس میں ایک دوسرے کو مبارک باد پیش کرتے ہیں۔ ——— "ہمارے نشانے سے بچ نکلنا آسان نہیں ——— آخری منظر خوب تھا۔ کاش روزانہ اسی طرح دو ایک قیدی فرار ہوتے رہیں، چھ ماہ کے اندر اندر ہم اس سخت ڈیوٹی سے فراغت پا جائیں گے کیوں ٹھیک ہے نا ———!" پھر دونوں فوجی قہقہہ لگاتے ہیں۔

ستمبر ۱۹۶۵ء میں انڈونیشیا کے محبّ وطن اور ترقی پسند عناصر نے ملک سے سامراجی ریشہ دوانیوں کو ختم کرنے کے لیے جدوجہد شروع کی مگر امریکی سامراج اور اس کے ایجنٹ اس تحریک کو کچلنے کے لیے پہلے سے تیار بیٹھے تھے۔ ترقی پسند عناصر کی یہ بغاوت طاقتور اور منظم نہ تھی چنانچہ رجعت پسندوں اور دائیں بازو کے فوجیوں نے انڈونیشیا کے موجودہ صدر جنرل سوہارتو کی قیادت میں اس بغاوت کو بڑی آسانی سے

بیشیا کے

یمپ

زہ خیز

تان



شاعر اور ادیب پرامودیا



برو کے لیبر کیمپ کا
ایک قیدی

ں کر دیا گیا

عیم الحسن

سے

یرا قلم

ین لیا

گیا

کچل دیا۔ بات یہیں ختم ہو سکتی تھی مگر امریکہ اس بات پر قطعی آمادہ نہ تھا —— وہ چاہتا تھا کہ اس ناکام بغاوت سے فائدہ اٹھا کر انڈونیشیا کے محبِّ وطن اور ترقی پسند عناصر کو اس حد تک تباہ کر دیا جائے کہ وہ آئندہ کم از کم بیس پچیس سال تک سر نہ اٹھا سکیں۔ اس معاملے کو خوش اسلوبی سے انجام دینے کے لیے "سی آئی اے" نے مکمل رپورٹ تیار کر رکھی تھی۔ چنانچہ دائیں بازو کے اقتدار میں آتے ہی سوشلسٹوں اور کمیونسٹوں کو "پلنگ" کے نیچے سے تلاش کرنے کی مہم شروع کر دی گئی۔ فرقہ پرست اور مذہبی جماعتوں نے حکومت سے روپیہ اور آسائشیں حاصل کر کے ان کے خلاف کفر اور قتل کا فتویٰ صادر کر دیا —— عوام سے کہا گیا کہ "ایک سوشلسٹ کے سر کی قیمت ایک روپیہ!" یہ بات دنیا بھر کے اخبارات میں شائع ہو چکی ہے کہ ۱۹۶۵ء کے آخر تک محض شبہے کی بنا پر پانچ لاکھ انڈونیشی افراد کو تہہ تیغ کر کے چنگیز اور ہلاکو کی بربریت کو بھی مات کر دیا گیا۔ جو نوجوان قتل ہونے سے بچ گئے انہیں مختلف خطرناک جزیروں میں زندگی کی تمام نعمتوں سے محروم کر کے قید کر دیا گیا۔

ایک سروے ٹیم کی رپورٹ کے مطابق ان قیدیوں کی تعداد ایک لاکھ ستر ہزار تھی۔ ان میں سے اب بھی ہزاروں قیدی اسی طرح جانوروں کی زندگی گزار رہے ہیں۔

صرف "برو" کے جزیرے میں تقریباً پندرہ ہزار انسانوں کو قید کیا گیا ہے۔ ان کے خلاف آج تک کسی عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا گیا —— نہ ہی انہیں قانونی طور پر پابندِ سلاسل کیا گیا —— ان پر صرف ایک ہی الزام ہے کہ وہ کمیونسٹ ہیں —— یا کمیونسٹ نواز ہیں —— موجودہ انڈونیشی حکومت کے نزدیک یہ ایک سنگین اور ناقابلِ معافی جرم ہے —— اس کی سزا یہ ہے کہ ملزم کو مقدمہ چلائے بغیر گولی سے اڑا دیا جائے "برو" کے جس حصے میں ان قیدیوں کو رکھا گیا ہے اس کا نام "ایمین" ہے۔ "ایمین" کے چاروں طرف چوبیس گھنٹے تیز رفتار فوجی اسٹیمر گشت کرتے رہتے ہیں۔ فوجیوں کو ہدایت کر دی گئی ہے کہ "جو آدمی فرار ہونے کی کوشش کرے اسے گولی سے اڑا دو، رحم مت کرو!"

جزیرہ "برو" رقبہ کے لحاظ سے جزیرہ بالی سے بڑا ہے۔ بے شمار گھنے جنگلات اور سرسبز پہاڑیاں ہیں۔ بحرِ ہند میں پلنے والی سست مگر خوفناک شارک مچھلیاں اس جزیرے کے کنارے تک چلی آتی ہیں اور بے خبری میں کوئی بھی چیز لقمۂ اجل بن جاتی ہے۔ مقامی آبادی تقریباً چالیس ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ ماہی گیری اور کھیتی باڑی ان کا پیشہ ہے۔

۱۹۶۹ء میں پہلی مرتبہ سیاسی قیدیوں کو جاوا سے اس جگہ منتقل کیا گیا۔ "ایشیا میگزین" کے رپورٹر ڈام مریاس نے مقامی لوگوں سے ان سیاسی قیدیوں کے بارے میں معلومات

حاصل کیں تو انہوں نے کانپتے ہوئے بتایا ——— "ان کی حالت نہایت ہی ابتر تھی ——— جانوروں سے بھی بد تر!" فوجیوں نے انہیں علیحدہ علیحدہ سیلوں میں قاتل خونی اور ڈاکوؤں کے ساتھ بند کر دیا جو ان کی تھوڑی بہت خوراک بھی چٹ کر جاتے اور ان کے جسم کو پھلدار چاقو سے چیر دیتے اور پھر وحشیانہ انداز سے قہقہے لگاتے۔ یہ منظر دیکھ کر فوجی بھی خوب ہنستے اور سیاسی قیدیوں کو تھپڑ مار کر مذاق اڑاتے ——— "اس کے بعد تمہارے جسم کو سمندر میں پھینک دیں گے۔ تاکہ بھوکی شارک تمہیں مزے مزے سے ہڑپ کر جائیں"

انہوں نے بتایا کہ سیاسی قیدیوں کو سیلز میں دس سے کر بارہ گھنٹے تک بند رکھا جاتا تھا۔ انہیں باہر کے حالات اور خبروں سے محروم رکھا جاتا۔

"برو" کے سیاسی اسیروں میں ممتاز قانون دان ڈاکٹر سپارپاتو اور انڈونیشیا کے عظیم ناولسٹ اور شاعر پرامودیا اناتاتور بھی شامل ہیں۔

بیرونی دنیا کے مسلسل دباؤ سے مجبور ہو کر ۱۹۶۹ء میں "برو" کے سیاسی اسیروں کے کیمپ کا دروازہ تھوڑا سا کھولا گیا اور پہلی بار چند گنے چنے نمائندوں کو جکارتا حکومت نے کیمپ کے معائنے کی اجازت دی۔ اس کے لیے پہلے درخواستیں طلب کی گئیں۔ درخواستوں کی کڑی اسکریننگ کی گئی۔ اور صرف چند غیر ملکی نامہ نگاروں کو جو جکارتہ میں مقیم تھے "برو" جانے کی اجازت دی گئی۔ "تاس" نیوز ایجنسی کے نمائندے کی درخواست کو مسترد کر دیا گیا۔ اس دوران ایک دلچسپ واقعہ ہوا۔ "ایشین میگزین" کے نمائندے کی درخواست کو مسترد کر دیا گیا۔ میگزین کے نمائندے نے سخت غصّے کے عالم میں فوجی حکام سے کہا ——— "میں محسوس کرتا ہوں کہ حکومت مجھ سے کچھ چھپانا چاہتی ہے اور میں یہ بات اپنے مضمون میں لکھوں گا ——— !"

فوجی افسر نے غضبناک لہجے میں کہا ——— "کیا لکھو گے، تم ثابت نہیں کر سکتے !"

رپورٹر نے اسی قدر چیخ کر کہا ——— "مضمون میں دیکھ لینا !"

فوجی افسر رپورٹر کے اس جملے سے "جھاگ" کی طرح بیٹھ گیا اور پھر بڑے ٹھنڈے لہجے میں جواب دیا ——— "خیر ——— خیر ——— تم "برو" جا سکتے ہو!"

"برو" کا انچارج جنرل وادلی تھا۔ چال ڈھال، بول چال اور لہجے سے اکّھڑ! مگر اس کے منہ کا دہانہ شارک مچھلی کی طرح تھا۔ چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہمدردی اور جذبات سے عاری تھیں۔ وہ تمام دن اپنے جونیئر افسروں کے ساتھ تاش کھیلتا تھا اور انتہائی بھونڈے پن سے قہقہہ لگاتا تھا۔ اسے خوش کرنے کے لیے اس کے جونیئر افسر اس کے بے ہنگم قہقہے میں اس کا ساتھ دیتے تھے۔

جنرل وادلی نے اخباری نمائندوں سے بات چیت کرتے ہوئے کہا کہ ——— "اس کیمپ کے قیدیوں





"رحم مت کرو

انھیں گولی سے اڑا دو"

جنرل والدلی کا حکم

میں یونیورسٹی کے طلباء، اساتذہ اور ماہرینِ معاشیات شامل ہیں۔ میرے ساتھ جتنے بھی فوجی ہیں وہ زیادہ تر مسلمان عیسائی، ہندو اور بدھ مذہب کے پیروکار ہیں ——— مگر یہ سیاسی قیدی کمیونسٹ ہیں ——— !" اس جنرل کی آنکھوں میں "نکرنے" کی چمک تھی۔

کیمپ نمبر ایک کا میدان اور جھونپڑیاں "تنگ اور چھوٹی تھیں۔ سیاسی قیدیوں نے انہیں بڑی مضبوطی سے تعمیر کیا تھا ——— صاف ستھری جھونپڑیاں ——— قطار کی سب سے پہلی جھونپڑی کے سامنے دو قبریں بنی ہوئی تھیں ——— یہ قبریں ان دو نوجوان حریت پسندوں کی تھیں جو "برو" سے فرار ہونے کی کوشش میں گولیوں کا نشانہ بن گئے ——— ان کی لاشیں ان کے خاندان تک پہنچانا مشکل تھا، اس لیے انہیں "برو" کیمپ ہی میں دفن کر دیا گیا ——— شاید ان کے عزیزوں کو ان کی موت کی اطلاع دینے کی زحمت بھی نہیں کی گئی۔

ایک جھونپڑی کے سائے میں ایک ادھیڑ عمر کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ تھکا ہوا تھا۔ اس کے کپڑے میلے اور پھٹے ہوئے تھے۔ رپورٹر اس کے قریب سے گزرے تو اس نے بڑی عاجزی سے ایک سگریٹ طلب کی۔ ایک رپورٹر نے آگے بڑھ کر اسے سگریٹ پیش کی۔ اس نے سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش کھینچا اور آنکھیں بند کر کے جھونپڑی کی دیوار سے ٹک گیا ——— لیبر کیمپ کے قیدی بڑی مقدار میں تمباکو کی کاشت کرتے ہیں مگر انہیں تمباکو سے محروم رکھا جاتا ہے۔ کبھی کبھار انہیں پینے کے لیے سگریٹ دے دیا جاتا ہے۔ تمباکو کو برو کے بازار میں فروخت کر کے ساری رقم سرکاری خزانے میں جمع کر دی جاتی ہے۔

——— وہ آدمی زیادہ ضعیف نہ تھا۔ اس کی عمر بمشکل چالیس سال ہوگی۔ وہ "سورابایا" میں بیٹی کلرک تھا۔ اس کی یونین کمیونسٹ پارٹی میں شامل تھی۔ اسے ۱۹۶۵ء میں گرفتار کیا گیا۔ اس کے بیوی بچے موجود ہیں مگر گرفتاری کے بعد سے اسے آج تک بیوی بچوں سے

ملنے نہیں دیا گیا۔

اس نے بڑی دھیمی اور خوفزدہ آواز میں کہا کہ "مجھے قطعی علم نہیں ہے کہ وہ کس عالم میں ہوں گے ——"

دوسری جھونپڑی میں ایک دوسرے قیدی سے رپورٹر نے سوال کیا :۔

"کیا تم "بُرو" میں خوش ہو ؟

قہقہہ —— "ہاں —— ہاں —— مَیں بہت خوش ہوں —— !"

"حکومت کہتی ہے کہ تم لوگ یہاں بہت خوش ہو ؟"

(پہلے سے زیادہ بلند قہقہہ) —— "ہاں —— ہاں بالکل —— بالکل —— !"

اس نے انگلی سے ایک نوجوان قیدی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا —— "۱۹۶۵ء میں جب اسے گرفتار کیا گیا تو اس کی عمر صرف بارہ تیرہ سال تھی۔ اب اس کی عمر اٹھارہ انیس سال ہے۔ جب اسے گرفتار کیا گیا تو حکومت نے الزام لگایا تھا کہ یہ بہت خطرناک کمیونسٹ ہے —— جی ہاں —— اسے دیکھئے یہ بہت خطرناک کمیونسٹ ہے —— !" سیاسی قیدی نے اپنی بات ختم کر کے زبردست قہقہہ لگایا۔

انڈونیشی دانشور ڈاکٹر سپاریاتو اور ممتاز ادیب و شاعر پراموَدیا کو پہلی بار جب اخباری نمائندوں کے سامنے پیش کیا گیا تو وہ کسی ننھے منے بچے کی طرح پریشان تھے انہیں پریس کے سامنے پیش کرنے سے پہلے صاف ستھرے کپڑے پہنا دیے گئے تھے۔

پراموَدیا نے کہا —— "اتنے عرصے بعد اخباری نمائندوں سے مل کر مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے !" اس کی آواز نرم مگر خوف میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ایک نمائندے نے ان سے سوال کیا :۔

"کیا افسروں نے انہیں بریف کیا ہے ؟"

اس سوال سے وہ زیادہ پریشان ہو گئے۔ انہوں نے اپنے چاروں طرف کھڑے ہوئے فوجیوں کو دیکھا، کھڑکی کی طرف نظر دوڑائی جہاں فوجی مشین گن پکڑے ہوئے اسے گھور رہے تھے۔ اس نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے قہقہہ بلند کیا —— "اس کے بارے میں مَیں کیا کہہ سکتا ہوں !"

"کیا لکھنے پڑھنے کے لیے آپ کو کاغذ اور قلم مہیا کیا جاتا ہے —— ؟" ایک رپورٹر نے سوال کیا۔

"اس سوال کا جواب دینا بہت مشکل ہے !" اس نے فوجیوں کی طرف دیکھا پھر جلدی سے کہا ——



انڈونیشی ادیب و شاعر پراموَدیا کی بیوی اور چھوٹا لڑکا۔ طویل جدائی کا غم چہرے سے ظاہر ہے

مجھے نہیں معلوم کہ میرے بیوی بچے کس عالم میں ہوں گے

—— "ہاں —— ہاں —— دیا گیا ... !"

ڈاکٹر سپاریاتو اور شاعر پراموَدیا کے آٹھ بچے ہیں۔ ڈاکٹر سپاریاتو نے کہا —— "اس کی بیوی تپِ دق کی مریضہ ہے —— وہ اسے یہاں نہیں بلوا سکتا۔ کیونکہ یہاں دوائیں نہیں ملتیں"

انہوں نے رپورٹروں کے اس سوال کے جواب میں کہا —— "انہیں ان کے بیوی بچوں کے متعلق کوئی خبر نہیں ہے۔ اس دوران پراموَدیا کو اس کی بیوی کے صرف دو خط ملے۔

ڈاکٹر سپاریاتو نے کہا کہ —— "وہ اپنے بیوی بچوں کو برابر خط لکھتا ہے مگر شاید انہوں نے اپنی مصروفیتوں کی وجہ سے ان کا جواب نہ دیا۔"

پراموَدیا نے کہا کہ —— "اگر موقع ملا تو مَیں ماضی کے واقعات قلمبند کروں گا —— مگر نہیں شاید مَیں ایسا نہ کر سکوں۔ کیونکہ اب مَیں بہت تھک گیا ہوں، بہت تھک گیا ہوں، کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں —— "بُرو" میں ہمارا کوئی مستقبل نہیں ہے، میں جاوا واپس جانا چاہتا ہوں" —— پراموَدیا نے کہا —— "کبھی میں انڈونیشیا کی ہر چیز کو آزاد دیکھنا چاہتا تھا —— مگر —— مَیں خود قید ہو گیا ہوں —— یہ میری زندگی کے اذیتناک لمحات ہیں۔ میری آزادی ختم ہو گئی، مجھ سے میرا خاندان بچھڑ گیا، مجھ سے میرا قلم لے لیا گیا —— ایک دن مَیں لکھوں گا، ضرور لکھوں گا، یہی میری زندگی کا مقصدِ اعلیٰ ہے —— اس کام سے مجھے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی !!!"

چوتھا آدمی

ریاض اقبال لودھی

میں اس سرد ٹھٹھری ہوئی جھونپڑی میں تنہا اپنے سامنے رکھی ہوئی چارپائی پر کفن میں لپٹی لاش کی حفاظت کر رہا ہوں اس لاش کے گرد ہزاروں بدروحیں بھیانک انداز میں رقص کر رہی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ آدم کے اس سوتیلے بیٹے کی بے بسی اور محرومی پر خوشیاں منا رہی ہوں۔

شاید میری موجودگی کا احساس ہے ورنہ کوئی نہ کوئی بدروح اس لاش میں حلول کر جاتی جیسا کہ رامو چاچا کا خیال ہے۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں توہمات پر یقین نہیں رکھتا لیکن اس خیال کو جھٹلا بھی نہیں سکتا کیونکہ یہ میرے آباؤ اجداد کی روایت ہے جو سینہ بہ سینہ ہم تک منتقل ہو رہی ہے ——!

جوں جوں وقت گزر رہا ہے میں اپنے پورے وجود میں حیرت انگیز تبدیلی محسوس کر رہا ہوں۔ میری پتھرائی آنکھیں خوف سے اس جھونپڑی کی بوسیدہ کانپتی دیواروں میں جذب ہو چکی ہیں۔ یہ بوسیدہ دیواریں میرے ہی وجود کا جزو ہیں میرے وجود کا خول بے ڈھنگ پیلے لمحوں کے حصار میں ہے بے ڈھنگ پیلے لمحے جو انسانی وجود کو دیمک کی طرح چاٹ کر کھوکھلا کر دیتے ہیں۔ میرے اندر کا وجود پیلے لمحوں کے خوف سے تیزی سے سکڑ رہا ہے۔ یہ سکڑنے کا عمل اتنا شدید ہے کہ میرے اندر کے وجود میں چھپے ہوئے کیڑے تیزی سے رینگنے لگے ہیں۔ وہ شاید راہِ فرار اختیار کرنا چاہتے ہیں لیکن فرار کے تمام راستے مسدود ہو چکے ہیں۔ اب میں محسوس کرتا ہوں۔

جیسے وہ تھک چکے ہوں اور کہہ رہے ہوں ——

—— دروازہ کھولو —— ہمیں روشنی کی تلاش ہے —— لیکن یہ دروازہ تو ازل سے ہی بند ہے۔ اگر کھل بھی گیا تو باہر پھیلی ہوئی تاریکیاں ان ننھے منے کیڑوں کو ہڑپ کر جائیں گی —— اچانک باہر بیساکھی کی کرخت آواز سنائی دیتی ہے جو لحظہ بہ لحظہ جھونپڑی کے قریب آ رہی ہے۔

شاید —— چوتھا آدمی ——!!

میرا بکھرا وجود اپنی اصلی حالت میں لوٹ آتا ہے۔ میں سراپا انتظار بن کر آنے والے شخص کا خیر مقدم کرنے کے لیے تیار ہو چکا ہوں۔ مگر باہر پر ہول سناٹے کے سوا کچھ بھی نہیں۔ کبھی کبھی کوئی کوا اپنی مکروہ آواز میں چیختا ہوا غائب ہو جاتا ہے۔ تب میں سوچتا ہوں —— کیا پھر کوئی ہابیل کسی قابیل کی لاش کے قریب بیٹھا زمین کے پھٹنے کا منتظر ہے؟

میری توجہ چارپائی پر رکھی لاش کی جانب مبذول ہو جاتی ہے۔ یہ لاش میرے عزیز دوست رامو کی ہے جو میرے ساتھ فیکٹری میں کام کیا کرتا تھا —— وہ دن بھر فیکٹری کی سیاہ چمنی میں کوئلے جھونکا کرتا۔ کوئلوں کا کسیلا دھواں اسے اندر ہی اندر چاٹتا رہا۔ آخر کار وہ کسیلے دھوئیں کا شکار ہو کر مر گیا۔ اب اس کی لاش کو دفن کرنے کے لیے ہمیں چوتھے آدمی کی ضرورت ہے۔ وہ کوئی خاص فرد نہیں، میرا مطلب ہے وہ کوئی بھی شخص ہو سکتا ہے —— اندھا لنگڑا، بھکاری یا کوئی بھولا بھٹکا مسافر!

ہمیں تو صرف دو کندھوں کی ضرورت ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ استعمال صرف ایک کندھا ہو گا مگر چوتھا آدمی سوالیہ بن گیا ہے۔ اس سلسلے میں اس آدھے انسان کا باپ فضلو دھوبی کے ساتھ آدھا گھنٹہ ہوا شہر چلا گیا ہے۔ وہ ابھی تک نہیں لوٹا۔ شاید چوتھا آدمی تلاش نہیں کر سکا۔ اس جھونپڑی کے اردگرد کھلا میدان ہے۔ پرسوں تک یہاں دوسری بہت سی جھونپڑیاں آباد تھیں لیکن سیٹھ امجد کی اندھی خواہش کی بھینٹ چڑھ گئیں۔ اس نے کل ہی نئے سینما کی بنیاد رکھی ہے کاش وہ جھونپڑیوں کے مکین یہاں موجود ہوتے تو ہمیں چوتھے آدمی کی ضرورت قطعاً محسوس نہ ہوتی۔

اس میدان سے پرے شاندار کوٹھیوں کی دو رویہ قطاریں ہیں جن کے مکین اس مرگ آسا سردی میں ایئرٹائٹ کمروں میں دبکے ہوئے ہیں بعض اوقات مجھے یوں لگتا ہے جیسے یہ لاش ابھی اٹھ کھڑی ہو گی اور خود کو کسی گہرے کھڈ میں دھکیل دے گی لیکن یہ محض میرا وہم ہے۔

کھٹ — کھٹ —— کھٹ !!! بیساکھی کی آواز دوبارہ سنائی دیتی ہے۔

چوتھا آدمی —— چوتھا آدمی !!!

دیواریں ہذیانی کیفیت میں چلانے لگتی ہیں۔ بیساکھی کی آواز جھونپڑی کے قریب آ کر رک جاتی ہے۔

اچانک دروازہ کھلتا ہے

چوتھا آدمی !

میری زبان سے بے اختیار یہ لفظ نکلتے ہیں۔ چوتھا آدمی بوڑھا —— اور کمزور جسم کا مالک ہے۔ اس کی دائیں ٹانگ گھٹنوں تک کٹی ہوئی ہے۔ اس ٹانگ کی کمی پوری کرنے کے لیے اس نے بیساکھی کا سہارا لے رکھا ہے۔ اس کے پیچھے رامو کا بوڑھا باپ اور فضلو دھوبی ہے۔ رامو کے باپ کے اشارے پر ہم چارپائی کو کندھوں پر اٹھا کر قبرستان کی طرف چل پڑتے ہیں۔ قبرستان یہاں سے دو فرلانگ کے فاصلے پر ہے۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے قبرستان اور اس جھونپڑی کے درمیان صدیوں کی مسافت حائل ہے۔ میرے دائیں طرف چوتھا آدمی چل رہا ہے۔

اس کی حرکت سے چارپائی ہچکولے کھا رہی ہے۔

چوتھا آدمی زیرِ لب کچھ بڑبڑا رہا ہے

شاید کوئی دعا ....!

اب اس کی آواز صاف سنائی دے رہی ہے۔ وہ خدا سے زمانے کی بے حسی کی شکایت کر رہا ہے۔ اس کی آواز میں بلا کا سوز و گداز ہے —— وہ مجھے اس زمین کا باسی نظر نہیں آتا ہے۔ میں سوچتا ہوں تدفین سے فارغ ہونے کے بعد اس مقدس اور عظیم انسان کے ہاتھ چوم لوں گا۔ اگر آج وہ نہ ہوتا تو ہم کبھی اس لاش کو دفن نہ کر سکتے۔ اب ہم قبرستان پہنچ چکے ہیں اور لاش کو قبر میں دفن کر رہے ہیں —— زمین کو اس کی امانت لوٹا رہے ہیں۔

باقی صفحہ ۴۴ پر ملاحظہ فرمائیں

ڈرائی کلیننگ کے محنت کش

ان کی حالت قرونِ وسطیٰ کے غلاموں سے بھی بدتر ہے

الفتح رپورٹ

کراچی کے کسی بھی حصے میں چلے جائیے ڈائیرز اینڈ ڈرائی کلینرز کی دکانیں دکھائی دیتی ہیں۔ ان کے جگمگ کرتے ہوئے نیو سائن بورڈ، صاف ستھرے اور بڑے بڑے شوکیس اور ان میں رکھے ہوئے صاف ستھرے چمکدار، دیدہ زیب ملبوسات خوشحال معاشرے کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان دکانوں کے ناموں پر امریکی اور برطانوی ناموں کی چھاپ لگی ہوتی ہے۔ بعض کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ وہ انٹرنیشنل ڈائیرز اینڈ ڈرائی کلینرز ایسوسی ایشن کے رکن ہیں اور بعض کو اس بات پر ناز ہے کہ شہر میں ان کی نو، دس شاخیں ہیں۔

کسی ڈائیرز اینڈ ڈرائی کلینرز شاپ میں جائیے تو بکنگ کلرک مسکرا کر آپ کا استقبال کرے گا۔ لیکن اس مسکراہٹ میں زندگی اور خوشحالی کی کوئی رمق نہیں ہوتی، مصنوعی اور کھوکھلی ہوتی ہے۔ واجبی کپڑوں میں ملبوس نحیف و نزار اور پچکے ہوئے گالوں والا کلرک آپ کے کپڑے بک کر کے ایک مرتبہ پھر مسکرا کر "تھینک یو" کہے گا۔ کیونکہ اسے اپنے مالک کی خوشنودی مطلوب ہے۔ دکان کے دوسرے حصے میں پریس مین عموماً بنیان میں نظر آتے ہیں، جن کے چہرے خشک، پیٹ پچکے ہوئے اور ہاتھوں کی رگیں ابھری ہوئی ہوتی ہیں چلتی پھرتی لاشیں ہوتی ہیں۔ ادارے کی یہ چمک دمک اور ملازمین کی یہ حالتِ زار ان تضادات کی مظہر ہیں۔ جو ہمارے معاشرے کے مختلف طبقوں کے درمیان ہے۔

ڈرائی کلین کا کاروبار کرنے والوں کا دعویٰ ہے کہ وہ معاشرے کی خدمت کرتے ہیں اسے "پاک صاف" رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔ لیکن وطنِ عزیز میں ڈرائی کلین کا کاروبار "خدمت" سے زیادہ "تجارت" بن گیا ہے جس کا مقصد دولت میں اضافہ اور منافع کمانا ہے۔ مہنگائی اور نقصان ہونے کا بہانہ بنا کر ہر سال ڈرائی کلین کے چارجز میں اضافہ کر دیا جاتا ہے۔ مالکان کہتے ہیں کہ ہمیں "خاص منافع" نہیں ہوتا لیکن ان کی دکانیں ایک سے دو، دو سے چار اور چار سے آٹھ ہو گئی ہیں اور نئی شاخوں کے اضافے کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔

مالکان کہتے ہیں کہ سوڈا اور صابن کی گرانی کی وجہ سے کوئی منافع نہیں ہوتا اس لیے ہم ڈرائی کلین کے چارجز میں اضافہ کرنے میں مجبور ہیں۔ ایک پتلون کی ڈرائی کلین کے چارجز ایک روپیہ ۵۰ پیسے ہیں لیکن بتایا جاتا ہے کہ ایک پتلون کی ڈرائی کلین پر بمشکل ۵۰ پیسے کی لاگت آتی ہے۔ ایک روپیہ فی پتلون منافع ہونے کے باوجود مالکان "ہل من مزید" کا نعرہ لگا رہے ہیں۔

سروے کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ ٹیٹرون، سلک اور نائیلون کے کپڑے سو فیصد کیمیکل واش کیے جاتے ہیں کیونکہ یہ ڈرائی کلین ہو ہی نہیں سکتے جب کہ ڈائیرز اینڈ ڈرائی کلینرز والے کہتے ہیں کہ ہم نے انہیں ڈرائی کلین کیا ہے چارجز بھی ڈرائی کلین کے لیے جاتے ہیں۔ اس طرح سے عوام کے ساتھ سراسر فراڈ کیا جاتا ہے ان کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ نوے فیصد کپڑے ڈرائی کلین کی بجائے دھوئے جاتے ہیں۔

صرف اونی (گرم) ملبوسات ڈرائی کلین کیے جاتے ہیں۔ سروے کے دوران یہ بھی معلوم ہوا کہ اکثر دکانوں میں ڈرائی کلیننگ کے پلانٹ نہیں ہیں اور بعض ادارے پلانٹ ہونے کے باوجود اسے استعمال نہیں کرتے بلکہ ڈرائی کلین کے نام سے کپڑوں کو واش کیا جاتا ہے۔

ڈرائی کلینرز ایک طرف تو عوام کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں دوسری طرف انہوں نے اپنے ملازمین پر عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ ان ملازمین کی حالت قرونِ وسطیٰ کے غلاموں سے بھی بدتر ہے۔

کراچی میں اس وقت تقریباً دس ہزار محنت کش ڈرائی کلیننگ کے اداروں سے وابستہ ہیں۔ ان کی تنخواہوں کا کوئی اسکیل مقرر نہیں۔ تنخواہ کے تعین اور اضافے کا انحصار مالک کی مرضی پر ہے۔ عموماً ابتدائی تنخواہ ۱۲۵ روپے اور زیادہ سے زیادہ ۱۷۵ روپے ماہانہ ہے۔ اکثر دکانوں میں بارہ بارہ سال پرانے ملازمین ہیں لیکن ان کی تنخواہ ۱۷۵ روپے سے آگے نہیں بڑھ پائی ہے۔ مگر ان کے مالک کی دکانوں میں ہر سال ایک دو کا اضافہ ضرور ہو جاتا ہے۔ ملازمین سے صبح آٹھ بجے سے رات کے آٹھ بجے تک یعنی بارہ گھنٹے کام لیا جاتا ہے اور اوور ٹائم بھی نہیں دیا جاتا، حالانکہ مروجہ قوانین کے تحت آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام نہیں لیا جا سکتا اور اگر آٹھ گھنٹے سے زیادہ کام لیا جائے تو اوور ٹائم دینا ضروری ہے۔

ان محنت کشوں کو گزیٹڈ ہالی ڈے کے علاوہ اور چھٹیاں نہیں ملتیں۔ حالانکہ شاپ ایکٹ کی رو سے دس اتفاقی، دس میڈیکل اور پندرہ دوسری سالانہ چھٹیاں ملنی چاہئیں۔ لیکن ڈرائی کلیننگ کے وڈیروں نے شاپ ایکٹ کی دھجیاں اڑا دی ہیں اور اربابِ اقتدار نے بھی انہیں قوانین کی کھلی خلاف ورزی کرنے کی چھوٹ دے رکھی ہے

اس پر ستم ظریفی یہ کہ تقرری کا پروانہ بھی نہیں دیا جاتا اور نہ برطرفی کا نوٹس دیا جاتا ہے۔ تقرری، ترقی اور برطرفی کے کوئی اصول و ضوابط نہیں۔ مالک کی مرضی ہے جتنی چاہے تنخواہ دے اور جب چاہے برطرف کر دے۔ بتایا جاتا ہے کہ تنخواہ بھی ڈیڑھ ماہ کے بعد ملتی ہے۔ لیکن تنخواہ کے رجسٹر پر ایک ماہ کے بعد ہی وصولی کے دستخط لے لیے جاتے ہیں اور اس طرح سے شاپ انسپکٹروں کو دھوکہ دیا جاتا ہے۔

ڈرائی کلیننگ کے محنت کشوں کے روزگار کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ اپنے حقوق کے لیے ڈرائی کلینرز ورکرز فیڈریشن بنائی۔ امریکانو، نیووے، سن شائین سنو وائٹ اور ٹپ ٹاپ میں یونینیں بن گئیں۔ انہوں نے اپنی اپنی انتظامیہ کے سامنے اپنے مطالبات پیش کیے اور اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے جدوجہد شروع کی۔ محنت کشوں کے اس اتحاد اور شعور سے ان مالکان کو جن کے ہاں ابھی یونین نہیں بنی تھیں، خطرہ پیدا ہوا "پاک صاف" ڈرائی کلینرز کے مالک منیر عالم نے جو ریٹائرڈ آئی جی اسپیشل پولیس ابوظفر کے فرزند ارجمند ہیں، یونین سازی میں مصروف کارکنوں کو برطرف کرنا شروع کردیا۔ "پاک صاف" ڈرائی کلینرز کی نو شاخیں ہیں گزشتہ دنوں اس نے پانچ ملازمین کو برطرف کر دیا جن میں عبداللطیف ڈار، وسیم، پریس مین عبدالعزیز محمد رفیق اور طارق روڈ کے برانچ مینجر جان محمد شامل ہیں۔

ڈائیرز اینڈ ڈرائی کلینرز کے محنت کشوں کا مطالبہ ہے کہ دیگر انڈسٹریز کی طرح اس صنعت کے محنت کشوں کے باقاعدہ تنخواہوں کے اسکیل مقرر کیے جائیں اور دوسری تمام دیگر مراعات، بونس، میڈیکل اور گریجویٹی دی جائے اور روزگار کا تحفظ فراہم کیا جائے۔



پیپلز پارٹی کی تنظیم ۔ عوام اور کارکن کیا کہتے ہیں

اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی



صابر حسین صدر پیپلز پارٹی تصنیف آباد، اقبال کالونی کراچی

(۱) ——— پارٹی کے کارکنان جو کہ حکومت کی باگ ڈور سنبھالے ہوئے ہیں اور وہ کارکنان جو کھلے میدانوں میں بیٹھ کر عوام سے رابطہ قائم کیے ہوئے ہیں، قابلِ مبارکباد ہیں جو اپنے سربراہ کا جذبہ اور لگن دیکھ کر یہ بھی میدان میں دوڑ لگا رہے ہیں ہو سکتا ہے کہ ان میں چند دانے ناقص بھی ہوں مگر جو جوہری بڑا دانا اور ذی فہم ہے وہ ناقص دانوں کو ضرور پرکھ لے گا اور ان ناقص دانوں کو جلد ہی بھٹی میں پھینک کر پگھلا دے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ناقص دانے بھٹی کی تپش سے کندن بن جائیں ۔ چونکہ اکثریت اچھے دانوں کی ہے لہذا اس سلسلے میں فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں ہے

(۲) ——— عوام کی توقعات پوری ہونے کے قوی امکانات ہیں، توقعات پوری ہوتی جا رہی ہیں ۔ عوام پُر امید ہیں ملک میں شرپسند عناصر اور جذباتی لوگ عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں مگر اس کے باوجود عوام، پیپلز پارٹی کے سربراہ اور ان کے کارکنوں کے جذبات دیکھ کر ان شرپسند عناصر کو پنپنے نہیں دیں گے ۔

(۳) ——— پارٹی کی قیادت اور کارکنوں میں رابطہ بالکل برائے نام ہے اور خلا روز بروز بڑھتا جا رہا ہے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ پارٹی کی تنظیم ناقص ہے ۔ کارکن اپنے علاقہ کے عوام کے مسائل لے کر دفاتر کے چکر کاٹتا پھرتا ہے اور اس فکر میں رہتا ہے کہ کس قیادت کو پکڑے ۔ اسی تگ و دو میں کافی وقت ضائع ہو جاتا ہے ۔ اگر کارکن خوش قسمتی سے کسی قیادت کو پکڑنے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو قیادت بجبوراً دو لفظ کہہ کر اپنا پیچھا چھڑا لیتی ہے ۔ اس کے بعد عوام اور کارکن کا مقدر ہے کہ کام ہو یا نہ ہو، اس سلسلے میں قیادت کو کوئی پرواہ نہیں ۔ ان کی بلا سے مُردہ دوزخ میں جائے یا جنت میں! عوام کے مسائل کے کاغذات، رہنما متعلقہ دفتر جہاں مسائل کے حل کی تکمیل ہونی ہے، بھیج دیتا ہے ۔ اس کی نہ تو یاد دہانی کرائی جاتی ہے اور نہ ہی تکمیلی رپورٹ مانگی جاتی ہے نتیجۃً متعلقہ دفتر مسائل کے کاغذات کو سرد خانے میں ڈال دیتا ہے اور پھر کارکن جس نے اتنی کوشش کی ہوتی ہے، اپنے علاقہ کے عوام سے منہ چھپاتا پھرتا ہے ۔ اس خلا کی وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستان پیپلز پارٹی کے دفتروں کا کوئی نگران نہیں ہے آج تک کسی سربراہ نے کسی دفتر میں جا کر کارکردگی اور مشکلات کا کوئی جائزہ نہیں لیا اور نہ آج تک پارٹی کے دفتروں کا کوئی لائحہ عمل پیش کیا ۔ میرے خیال میں پارٹی کی قیادت یا سربراہ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کراچی میں پارٹی کے دفاتر کتنے ہیں ——— !

(۴) ——— بقول شاعر ؎

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں !
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی ؛

سرکاری عہدوں پر جانے والے رہنما عوامی مسائل حل کرانے کی کوششوں میں مصروف ہیں ۔ ان کو اپنی ہی خبر نہیں لہذا ایسی صورت میں کارکنوں کے رویے کے بارے میں سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

(۵) ——— کارکنوں کے اتحاد اور تنظیم کی تجاویز حسبِ ذیل ہیں ۔

(ا) کسی بھی سربراہ کو جو انتظامی معاملات میں عبور رکھتا ہو اس کو کراچی کے پیپلز پارٹی کے دفتروں کا نگرانِ اعلیٰ مقرر کیا جائے ۔

(ب) اس نگرانِ اعلیٰ کی سرکردگی میں "سب نگران" مقرر کیے جائیں اور ان کو حصہ رسد دفتر برائے تنظیم تقسیم کر دیئے جائیں یعنی حلقے بنا دیئے جائیں اور ان حلقہ افسروں کو مکمل طور پر پابند کر دیا جائے کہ وہ اپنے علاقہ کے دفتر کے مکمل انچارج ہوں گے اور دفتروں کا نظم و نسق سنبھالیں گے ۔ اور کارکنوں اور عوام کی مشکلات دور کرنے کی کوشش کریں گے اور دفتروں کے طریقِ کار تجویز کریں گے ۔

(پ) ہر حلقہ افسر یعنی "سب نگران" اپنے علاقہ کے دفاتر میں ہفتہ میں ایک بار اجلاس بلوانے کا پابند ہو گا متعلقہ دفتر کے کارکن اجلاس میں عوامی مسائل کو حل کرنے کی غرض سے پیش کریں گے ۔ سب نگران ان مسائل کو اپنے رجسٹر میں درج کرے گا اور جب تک وہ عوامی مسائل حل نہ کر لیے جائیں رجسٹر میں ان کو "پینڈنگ" بتایا جائے گا ۔ اور جس دفتر کو مسائل حل کرنے کے لیے بھیجے گئے ہوں ان کو برائے تکمیل ریمائنڈر جاری کرتے رہیں گے ۔

(ت) حلقہ افسر عوام کے مسائل حل کرنے کے کاغذات دفتر متعلقہ کو اپنے نگرانِ اعلیٰ کی معرفت روانہ کرے گا ۔

(ج) حلقہ افسر پیپلز پارٹی کے دفتروں کے کارکنوں کی مشکلات بھی سنیں گے اور ان کے حل کرنے کی کوشش کریں گے ۔

(د) نگرانِ اعلیٰ ایک ماہ میں ایک بار ہر دفتر میں اپنا اجلاس کرے گا اور تمام کارکردگی کی جانچ پڑتال کرے گا اور کارکنوں سے تبادلۂ خیالات کرے گا ۔

(۶) ——— ہمارے علاقہ کی آبادی غریب اور محنت کش عوام پر مشتمل ہے اس لیے پیسہ لینے دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ اور نہ ہی ہمارے علاقہ میں ایسے واقعات ہوئے ہیں ۔

(۷) ——— حکومت چونکہ داخلی و بیرونی زاویوں کو کنٹرول کرتی ہے ۔ اس لیے پارٹی کو حکومت پر کنٹرول نہیں کرنا چاہیئے ۔ بلکہ پارٹی کو اس بات کا ضرور اختیار حاصل ہو کہ عوامی مفادات کے خلاف جاری کیے ہوئے احکام پر حکومت سے وضاحت طلب کر سکے اور ان کو کالعدم کرائے ۔ پارٹی کی حیثیت ایک نگران کی ہونی چاہیئے

(۸) ——— اس قسم کے واقعات سننے میں آئے ہیں مگر اس میں کارکنوں کا کوئی قصور نہیں ہے ۔ کیونکہ نہ تو کوئی راہ دکھانے والا، نہ کوئی سمجھانے والا اور نہ کوئی طریقِ کار بتانے والا ہے ۔ لہذا جیسی، جس کی عقل ہے کام کر رہا ہے ۔ عام کارکن پولیس، انتظامیہ اور عدلیہ کے کاموں میں مداخلت کا تصور تک نہیں کرتے، ہو سکتا ہے کہ جو کنونشن لیگی پیپلز پارٹی میں شامل ہو رہے ہیں ۔ وہ اس قسم کا کاروبار کرتے ہوں ۔ ہمارے علاقے میں اس نوعیت کا کوئی واقعہ نہیں ہوا ۔

نئے آنے والے
پیپلز پارٹی کو
نقصان پہنچا رہے ہیں



وحید الدّین - صدر پیپلز پارٹی حلقہ نمبر ۵ - موچی گیٹ - لاہور

(۱) —— لاہور واحد شہر ہے جہاں سے پیپلز پارٹی نے تمام سیٹیں حاصل کیں مگر پارٹی نے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ایسے ایسے کارنامے سرانجام دیئے کہ اب تو پیپلز پارٹی سے اپنا تعلق ظاہر کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے جس طرح فتح مکہّ کے بعد کافروں نے اسلام میں جوق در جوق شامل ہونا شروع کر دیا تھا۔ بالکل اسی طرح بااثر اور منافق لوگ بھی پیپلز پارٹی میں شامل ہو کر اس کے کردار کو داغدار کر رہے ہیں جس کی ایک مثال قذافی سٹیڈیم لاہور میں صدر بھٹو کے جلسہ میں پرانے ورکروں پر فائرنگ ہے —— !

(۲) —— جب تک اس پارٹی سے سامراج کے "کاغذی شیر" اور سی آئی اے کے ایجنٹ نکل نہیں جاتے اس وقت تک یہ پارٹی کوئی کام نہیں کر سکتی۔

برسرِ اقتدار آنے سے پہلے یہ پارٹی سرمایہ داروں کو پھانسی کے پھندے دکھاتی تھی مگر برسرِ اقتدار آنے کے بعد حکومت نے ان کو اعلیٰ عہدوں پر مقرر کر دیا، اُن کے آگے گھٹنے ٹیک دیئے۔

(۳) —— پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد ۹۸ فیصد قیادت امیر طبقے کے ہاتھوں میں چلی گئی اور یہ برسرِ اقتدار لوگ وہ ہیں جن کے متعلق قائدِ اعظم نے کہا تھا کہ میں جس جیب میں بھی ہاتھ ڈالتا ہوں کھوٹے سکےّ نکلتے ہیں، تو جناب صدر بھٹو کی پارٹی کا بھی یہی حال ہے۔ ان لوگوں نے کارکنوں اور اپنے درمیان اس لیے خلا پیدا کر رکھا ہے تاکہ غریب کارکن ان کے قریب نہ آ سکیں لیکن وہ یہ نہیں جانتے کہ اس طرح خلاء پیدا کرنے سے طبقاتی نفرت پیدا ہوتی ہے

(۴) —— سرکاری عہدوں پر جانے والے تو یہ خیال کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اوپر ہی سے کرسی پر بٹھا کر زمین پر اتارا ہے مگر ان کو یہ معلوم نہیں کہ غریب اور انقلابی کارکنوں کی بدولت وہ سرکاری عہدے پر پہنچے ہیں۔ آج کل وہ سرمایہ داروں، میاں صاحبوں، خان صاحبوں، نواب صاحبوں کو بڑی عزت سے پاس بٹھاتے ہیں۔ جہاں یہ لوگ ہوں گے وہاں ایک غریب انقلابی کارکن کی کیا حیثیت ہو گی ؟

(۵) —— سب سے پہلے پارٹی کی از سرِ نو تنظیم کی جائے، کارکنوں میں اتحاد اور انقلابی جذبہ پیدا کیا جائے۔ کسی کے پاس دو عہدے نہیں ہونے چاہئیں۔ اگر سرکاری عہدہ ہے تو پارٹی کا عہدہ چھوڑ دینا چاہیئے کارکنوں کو یہ حق حاصل ہونا چاہیئے کہ وہ الیکشن کے ذریعے اپنے عہدیدار منتخب کریں اور ممبروں کو چاہیئے کہ وہ کارکنوں کی حوصلہ افزائی کریں۔

(۶) —— یہ بات تو بہت عام ہو گئی ہے کہ ممبروں کو خوب کمائی ہو رہی ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو پیپلز پارٹی کی کامیابی کے بعد پارٹی میں شامل ہوئے ہیں۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں جن سے غریب عوام بہت ڈرتے ہیں۔

(۷) —— میرے خیال میں پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔ کیونکہ حکومت میں اگر کوئی غلط کام کرے تو پارٹی اس کا سدّ باب کر سکے۔

پیپلز پارٹی کے کامیاب ہونے کے بعد شکست خوردہ افراد جو پہلے بھی بڑے بااثر تھے اور جن کا غریب انقلابی عوام نے الیکشن کے ذریعے جنازہ نکال دیا تھا پارٹی میں شامل ہو گئے۔ یہ لوگ پولیس کے کرائے کے ایجنٹ ہوتے ہیں جو ہر برسرِ اقتدار پارٹی کے ساتھ مل کر غریب لوگوں کا خون چوستے ہیں اور اب ایسے لوگ کثرت سے پیپلز پارٹی میں پائے جاتے ہیں۔



پارٹی کا عوام سے رابطہ ہوتا تو

عوام دشمن اپنے بل سے باہر نہ نکلتے

محمد انوار ناز، پروپیگنڈہ سیکرٹری پیپلز پارٹی۔ بہار کالونی۔ کراچی

(۱) — جہاں تک پارٹی کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد کردار کا تعلق ہے۔ اس بارے میں اتنا ضرور کہوں گا کہ پارٹی نے انقلاب کے راستے کو چھوڑ کر اصلاحات کے راستے کو اپنا لیا ہے اور اس پر وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن کا یہ فرمان کہ پاکستان پیپلز پارٹی ملی جلی معیشت کی قائل ہے۔ اس سے کارکنوں کو شدید مایوسی ہوئی۔ بقول لینن "اصلاحات انقلاب کو روکنے کا سہارا ہوتی ہیں۔"

میرے خیال میں پارٹی عوام کے کچھ حقوق دلانے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی مگر نوکر شاہی عوام پر ظلم و تشدد بدستور کرتی رہے گی۔ البتہ اس میں کچھ کمی ضرور ہو جائے گی۔

(۲) — پاکستان پیپلز پارٹی سے عوام نے بڑی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں۔ چونکہ پاکستان پیپلز پارٹی منشور کے مطابق اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ برسرِ اقتدار آنے کے بعد عوام کو روٹی، کپڑا، مکان، تعلیم اور علاج معالجہ کی سہولتیں فراہم کرے مگر جن حالات میں پارٹی کو اقتدار ملا وہ سب پر روزِ روشن کی طرح عیاں ہے۔ ملک کا اکثریتی صوبہ کٹ چکا تھا، ملک میں سیاسی اور اقتصادی افراتفری برپا تھی۔ مگر ان حالات کے باوجود صدر ذوالفقار علی بھٹو نے ملک کو زرعی، لیبر اور تعلیمی اصلاحات دے کر یہ ثابت کر دیا کہ پاکستان پیپلز پارٹی اپنے وعدے حتی الامکان پورے کرے گی۔ گو ان اصلاحات میں بھی کافی خامیاں ہیں مگر صدر بھٹو نے وعدہ کیا ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عوام کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں فراہم کی جائیں گی

(۳) — پاکستان پیپلز پارٹی کی قیادت میں جاگیردار، مفاد پرست اور سرمایہ دار بڑی تعداد میں شامل ہو گئے۔ ان کے متعلق کارکنوں میں شروع ہی سے شبہات تھے کہ یہ لوگ جو کسی نہ کسی طرح ہر حکومت میں شامل رہتے ہوئے بھی عوام سے رابطہ تو درکنار ان کے متعلق کچھ سوچنا بھی گوارا نہ کرتے تھے، اب پیپلز پارٹی میں آکر عوام کی کیا خدمت سرانجام دیں گے۔ مگر تمام کارکنوں کی نظریں چیئرمین بھٹو کی طرف مرکوز تھیں۔

جب پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو زیادہ تر صوبائی و ضلعی عہدیدار، مشیر و وزیر مقرر ہو گئے۔ جس سے پارٹی میں تنظیمی فقدان کا پیدا ہونا لازمی امر تھا۔ اس لیے ابھی سرکاری عہدیدار اور کارکنوں میں معمولی سا رابطہ قائم ہے۔ اور یہ رابطہ بھی اس وقت قائم ہوتا ہے جب کسی وزیر یا مشیر کو استقبالیہ یا جلسہ میں شرکت کی دعوت دی جائے اور اگر جلد ہی پارٹی اور عوام میں رابطہ بحال نہ کیا گیا تو اس پارٹی کا انجام بھی کنونشن لیگ سے مختلف نہ ہوگا۔

(۴) — سرکاری عہدے پر جانے والے وزیروں اور مشیروں کے رویّے کا اندازہ آپ ان کے بیانات سے لگا سکتے ہیں جس میں کارکنوں کو سرکاری دفاتر میں عوام کے کام کے لیے جانے سے منع کر دیا گیا ہے تاکہ کارکن نوکر شاہی کی لوٹ مار کو بے نقاب نہ کر سکیں۔ جہاں تک میرے علاقے کا تعلق ہے یہ جناب عبدالستار گبول کے تحت ہے۔ انہوں نے علاقائی کاموں کے لیے تمام اختیارات علاقائی یونٹ انچارجوں کو دے دیئے ہیں۔ کارکن تک ان کی رسائی بہت مشکل ہے۔ ویسے انہوں نے تین دن ہفتہ میں مقرر کر رکھے ہیں جب وہ عوام سے رابطہ مرکزی دفتر لیاری زون نمبر ۱ میں کرتے ہیں۔ مگر یہ رابطہ بھی یونٹ انچارجوں تک محدود رہتا ہے۔ اگر کوئی بھولا بھٹکا کارکن وہاں پہنچ بھی جائے تو اس کو اپنے کام کے لیے اپنے علاقے کے یونٹ انچارج کا کوئی تعارفی خط لانے کی ہدایت کی جاتی ہے اور اگر کوئی کارکن کسی یونٹ انچارج کے خلاف جائز شکایت بھی کرے تو بے سود کارروائی تو درکنار، اگر سن بھی لیں تو بڑی غنیمت ہے!

(۵) — ہمارے علاقے میں پارٹی تنظیمی فقدان کا شکار ہے۔ گو یہ علاقہ قانونی طور پر جناب عبدالستار گبول صدر لیاری زون نمبر ۱ کے ماتحت ہے مگر صدر لیاری زون نمبر ۲ احمد علی سومرو نے بھی یہاں پر اپنی "ڈیڑھ انچ" کی ایک الگ تنظیم بنائی ہوئی ہے۔ جہاں تک ہماری تنظیم جو لیاری زون نمبر ۱ سے وابستہ ہے، اس کے متعلق صرف اتنا عرض کروں گا کہ اس کے یونٹ انچارج نے اُن آدمیوں کو روپے لے کر شامل کیا ہے جو الیکشن میں ہمیں کافر اور ملحد گردانتے تھے۔

میرے خیال میں اگر تنظیم صحیح معنوں میں بنانی ہے تو پھر پارٹی میں الیکشن کرانا ہوگا اور اس کی ورکنگ کمیٹی کو مکمل اختیارات دینے ہوں گے۔ نامزدگیوں کا سلسلہ اب بند ہو جانا چاہیئے۔ اور اگر اب بھی ہمارے اعلیٰ عہدیداروں نے تنظیم کی طرف توجہ نہ دی تو اکثر مخلص لوگ کنارہ کش ہو جائیں گے اور باقی چند عناصر جو مفاد پرستوں پر مشتمل ہوں گے وہی رہیں گے۔

(۶) — مفاد پرست عناصر چڑھتا سورج دیکھ کر پارٹی میں شامل ہوتے ہیں۔ بہت سے بااثر عناصر نے مل مالکان سے مل کر ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اور گزشتہ جنگ میں بمباری کے دوران نقصان اٹھانے والوں میں سے اپنے جاننے والوں کو فائدہ پہنچایا اور ان کا فی "ایڈ" دلائی۔ حد تو یہ ہے کہ جن لوگوں کے پورے مکانات تباہ ہوئے ان کو بھی اتنا ہی ملا جتنا معمولی ٹین کی چھت ٹوٹنے سے ملا۔ یہ سب مثالیں موجود ہیں۔ چند وجوہات کی بنا پر میں نام دینے سے قاصر ہوں۔

(۷) — پارٹی کو حکومت پر کنٹرول کرنا چاہیئے۔ پارٹی کے اعلیٰ عہدیدار حکومت میں عہدیدار ہوتے ہوئے اتنا وقت نہیں دے سکتے کہ وہ عوام سے رابطہ قائم کر سکیں۔ اس طرح پارٹی عوام سے کٹ جاتی ہے

(۸) — عام کارکن کی نہ تو کوئی حیثیت ہے اور نہ کوئی مقام! اس لیے عدلیہ، پولیس اور سرکاری محکموں میں مداخلت کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ جب کوئی کارکن اپنے جائز کام کے لیے کسی مشیر یا وزیر کا "خط" لے کر نوکر شاہی تک پہنچتا ہے تو وہ رشوت نہیں لے سکتے۔ اس بات کو نوکر شاہی "سرکاری کاموں میں کارکنوں کی مداخلت" کا نام دے رہی ہے۔

اردو سندھی تحریک چلانے والے جاگیریں بچانا چاہتے ہیں: صفحہ ۱ سے آگے

"سندھ متحدہ محاذ نے ۱۹۶۹ء میں حتمی فیصلہ کیا تھا کہ اردو اور سندھی دونوں سندھ کی سرکاری زبانیں ہوں گی اور تمام تعلیمی اداروں اور سرکاری و نجی اداروں میں سندھی اردو ساتھ ساتھ نافذ کی جائے گی۔ لیکن اب کچھ لوگ لسانی تنازعہ کھڑا کرکے اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنا چاہتے ہیں۔"

۲۰ جون کو ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی صدر اردو تحریک ایکشن کمیٹی نے کہا کہ —— "صوبہ سندھ کو دو لسانی صوبہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ صوبے میں صرف سندھی سرکاری زبان کی حیثیت سے کامیاب نہیں ہو سکتی اس لیے دانشمندی یہی ہے کہ اردو اور سندھی کو یکساں طور پر صوبے کی سرکاری زبان قرار دی جائے۔"

سندھی زبان کی تعلیم،

فروغ اور استعمال کا "بل" مجریہ ۱۹۷۲ء

حکومت سندھ نے ۴ جولائی ایک گزٹ میں سندھی زبان کی تعلیم، فروغ اور استعمال کا "بل" مجریہ ۱۹۷۲ء شائع کیا۔ جس میں صوبہ سندھ کی صوبائی زبان سندھی کو قرار دیا گیا۔ یہ "بل" عبوری آئین کے آرٹیکل ۲۶۷ کے مطابق بنایا گیا تھا جس کے تحت کوئی بھی صوبائی اسمبلی قومی زبان کو متاثر کیے بغیر قومی زبان کے علاوہ صوبائی زبان کی تعلیم ترقی اور استعمال کے اقدامات قانوناً رائج کر سکتی ہے۔ حکومتِ سندھ کے اس لسانی "بل" میں کہا گیا تھا کہ سندھی کو لازمی مضمون کی حیثیت سے نچلے درجے یعنی چوتھی جماعت سے لازمی کیا جائے گا اور بتدریج بارہویں جماعت تک رائج کیا جائے گا۔ تمام تعلیمی اداروں میں چوتھی سے بارھویں تک اردو اور سندھی کو لازمی مضمون کی حیثیت دی جائے گی۔ سندھی زبان کو سرکاری محکموں، دفاتر، اسمبلی، عدالتوں اور اداروں میں بتدریج رائج کیا جائے گا اور اس سے قومی زبان اردو کی حیثیت پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔

۵ جولائی کو تحریکِ اردو کے صدر ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے سندھی کو صوبہ سندھ کی واحد سرکاری زبان بنانے سے متعلق بل کو مایوس کن قرار دیتے ہوئے کہا کہ اس "بل" میں صوبہ سندھ اور کراچی کے غیر سندھی باشندوں کے جذبات کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اسی دن ان کی قیام گاہ پر کراچی کے جماعتی اور عوام کے مستند شدہ رہنماؤں کا اجلاس ہوا۔ جس میں فیصلہ کیا گیا کہ جمعہ کے دن ہڑتال کی جائے۔ تمام تجارتی اور کاروباری ادارے، دکانیں، دفاتر اور صنعتی ادارے پورا دن بند رکھے جائیں، ٹرانسپورٹ بھی دن کے بارہ بجے تک بند رکھی جائے۔

۶ جولائی کو اسمبلی میں لسانی "بل" پیش ہونا تھا۔ اجلاس ساڑھے آٹھ بجے شروع ہونا تھا۔ لیکن اجلاس ۱۱½ بجے شروع ہوا کیونکہ قائد الیوان جناب ممتاز علی بھٹو حزبِ اختلاف سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ حزبِ اختلاف کی جانب سے "بل" میں تین ترمیمات پیش کرنے کا نوٹس دیا گیا جن میں سے دو ترمیمات برسرِ اقتدار جماعت تسلیم کرنے کا اقرار کیا اور تیسری ترمیم کے سلسلے میں غور کرنے کے لیے کچھ وقت مانگا۔ کہا جاتا ہے کہ حزبِ اختلاف کے ممبران نے جب اپنے ساتھیوں سے کہا کہ قائدِ الیوان نے دو ترمیمات مان لی ہیں اور تیسری پر غور کرنے کا کچھ وقت مانگا ہے تو جی اے مدنی نے کہا کہ تینوں ترمیمیں تسلیم کرنی پڑیں گی۔ اس سے کم ہم کسی بات پر تیار نہیں ہیں۔

صوبائی وزیر قانون و پارلیمانی امور سید قائم علی شاہ نے ایوان میں لسانی بل پیش کرتے ہوئے اپنی تقریر میں کہا کہ —— "یہ لسانی بل سندھ کے تمام عوام کے احساسات، جذبات اور امنگوں کا آئینہ دار ہے۔ اس میں سندھی کو صوبائی زبان قرار دیتے وقت قومی زبان اردو کی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا گیا اور اسے ایک بہترین مسودہ قانون کی شکل دینے کے لیے صوبے کے تقریباً ہر ایک طبقے سے صلاح مشورے کیے گئے۔ ان میں دانشور ماہرین اور حزبِ اختلاف کے رہنما بھی شامل ہیں۔"

پانچ قومیتوں کا
نعرہ لگانے والی
نیپ اپنے منشور کی
دشمن بن گئی

—— اس دوران سید سعید حسین پوائنٹ آف آرڈر پر کھڑے ہوئے اور کہا کہ —— "یہ "بل" آئین کے منافی ہے۔ میں نے عبوری آئین کے تحت حلف اٹھایا ہے۔ میں اس کا تحفظ کروں گا۔ اس بل میں عبوری آئین کی خلاف ورزی کی گئی ہے اور میں اس میں فریق نہیں بن سکتا۔" یہ کہہ کر وہ ایوان سے واک آؤٹ کر گئے۔ ان کے ساتھ ہی عبدالوحید عرشی بھی ایوان سے واک آؤٹ کر گئے۔

نواب مظفر حسین نے تجویز پیش کی کہ زبان کا مسئلہ صوبے کے لیے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ میری تجویز یہ ہے کہ اسے اسٹینڈنگ کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ اس موقع پر سیّد قائم علی شاہ نے بتایا کہ اسپیکر اس "بل" پر بحث کے لیے اپنی رولنگ دے چکے ہیں لہٰذا اب یہ بل کمیٹی کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔ لسانی بل پر کی جانے والی چند تقریروں کے اقتباسات درج ذیل ہیں۔

قائدِ حزبِ اختلاف شاہ فرید الحق

"وزیر قانون کی تقریر پر ہم میں سے کسی کو اعتراض نہیں۔ یہ تقریر ان لوگوں کے سامنے کی جائے جو سندھی زبان کی مخالفت کریں۔ ایسی ایک بھی مثال پیش نہیں کی جا سکتی کہ ہم نے سندھی کی مخالفت کی ہو ..... یہ ہمارا قصور نہیں کہ اردو کو کیوں قومی زبان بنایا گیا۔ یہ قائداعظم سے پوچھیں جنھوں نے اردو کو قومی زبان بنایا۔ یہ قومی اسمبلی کا فیصلہ تھا۔ اگر قومی اسمبلی چاروں صوبوں کی زبانوں کو قومی زبان قرار دے دے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ بنارس کی ہندو یونیورسٹی میں اردو کی مخالفت پر قائداعظم نے دو قومی نظریے کی حمایت کی تھی ...... سندھی بھی مسلمانوں کی زبان ہے۔ ہم اسے بھی سینے سے لگانے کو تیار ہیں۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ سندھی کو اردو کے ساتھ رائج کیا جائے لیکن ایوان میں اب تک جو تقریریں ہم نے سنی ہیں ان سے آپ کے ذہن کا پتہ چلتا ہے کہ اردو کی قیمت پر سندھی رائج کی جائے گی۔ اردو کو قومی زبان بنا کر صرف بوتل میں سجا کر نہیں رکھا جا سکتا، اسے عملی حیثیت سے رائج کیا جائے۔"

سیّد ظفر علی شاہ

"سندھی زبان کے اردو کے مقابلے میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ بعض طبقے بل کو اس عینک سے دیکھ

برطانوی دور میں سندھی صوبے کی سرکاری زبان قرار دی گئی

رہے ہیں کہ اس بل کا مقصد اردو کو نقصان پہنچانا ہے حالانکہ یہ قطعی غلط ہے . . . . سندھ میں گزشتہ ڈیڑھ سو سال سے سندھی سرکاری زبان کی حیثیت سے رائج ہے۔ انگریزوں کے دور میں بھی سندھی دفتروں اور عدالتوں میں رائج تھی۔ کالجوں، اسکولوں اور یونیورسٹی میں لازمی مضمون کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی تھی۔ سندھی ایک ترقی یافتہ زبان ہے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ۲۵ سال کے دوران سندھی زبان کے ساتھ ناانصافیاں ہوئی ہیں اور ان ناانصافیوں کا خاتمہ کرنے کے لیے یہ بل پیش کیا گیا ہے۔ عبوری آئین میں زبان کی حیثیت سے اردو اور بنگلہ دونوں کا ذکر ہے۔ اگر سندھی کے ساتھ اردو کو بھی صوبائی زبان کی حیثیت سے رائج کرنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو عبوری آئین کے مطابق بنگلہ کو بھی یہ درجہ دینا ہوگا۔ قومی زبان کی تعریف نہ آئین میں ہے اور نہ اس کی کوئی وضاحت کی گئی ہے میرے خیال میں قومی زبان وہ ہے جو قومی سطح پر استعمال ہو جب کہ صوبائی زبان قطعی الگ چیز ہے۔ ہم یہاں صوبائی زبان پر بحث کر رہے ہیں، حزبِ اختلاف کے رہنماؤں نے دو قومی نظریے کا ذکر کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب جھگڑا ہوتا ہے تو تقسیم ہی اس کا آخری علاج ہے . . . . . ہم امریکی نیگرو اور ریڈ انڈین بننے کے لیے تیار نہیں جن کا آج امریکہ سے نام و نشان مٹ گیا ہے، نہ ہی دوسرے درجے کے شہری بننے کے لیے تیار ہیں۔ ہم اردو کے مخالف نہیں ہیں لیکن اپنی زبان اور ثقافت کا تحفظ چاہتے۔"

عبدالوحید کٹپر

"ہندوستان کی تقسیم زبان کے مسئلے پر نہیں ہوئی۔ اگر ایسا ہوتا تو پاکستان یوپی، سی پی اور حیدرآباد دکن میں بنتا۔ پاکستان اقتصادی اور مذہبی بنیاد پر بنایا گیا تھا۔ ون یونٹ زبردستی مسلط کیا گیا اور سندھی زبان پر تالہ لگا دیا گیا —— جو لوگ اردو دوستی کا دعوے کرتے ہیں وہ دراصل اردو سے دشمنی کر رہے ہیں۔ اردو کے دوست نہیں ہیں۔ ایک اخبار نے لکھا ہے کہ "اردو کا جنازہ ہے بڑی دھوم سے نکلے"، میں کہتا ہوں اردو زندہ باد جنازہ اردو کا نہیں رئیس امروہوی اور میر خلیل الرحمٰن کا اٹھا ہے۔ انہیں اردو سے محبت نہیں بلکہ بغض معاویہ میں مخالفت کر رہے ہیں

یہ برادران یوسف ہیں۔"

ظہور الحسن بھوپالی

"حزبِ اختلاف کے کسی رکن نے کبھی یہ نہیں کہا کہ سندھی کو اس کا جائز اور نمایاں مقام نہ ملے۔ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ سندھی کے ساتھ اردو کو بھی سرکاری زبان بنایا جائے۔"

جی۔ اے۔ مدنی

"سندھی زبان کو کچلنے اور اسے پس ماندہ رکھنے کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ ون یونٹ کس نے بنوایا تھا۔ وہ مہاجر نہیں تھے بلکہ سندھ کے منتخب نمائندے تھے جنہوں نے سندھ اور سندھیوں کے پروانۂ موت پر دستخط کئے —— مسودہ آئین کی تین اہم دفعات ہیں اردو کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ قومی زبان کا ذکر صرف بل کے دیباچہ اور اغراض و مقاصد میں کیا گیا ہے، جو قانون کا حصہ نہیں ہوتے۔ اس بل کا مقصد اردو کی حیثیت کو نقصان پہنچانا ہے۔"

نواب مظفر حسین

"ہم سندھی کو اپنی زبان سمجھتے ہیں۔ اور اس کی ترویج و ترقی کے لئے تعاون کرنے کو تیار ہیں۔ ہم پر یہ الزام غلط ہے کہ ہم سندھی کے مخالف ہیں۔ ہم اسے قبول کر چکے ہیں۔ آخر کتنی مرتبہ قبول کرواؤ گے۔ ہم پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ ہمیں سندھ سے بھی محبت ہے۔ ہندوستان نے اسلام کی روشنی اسی صوبے سے حاصل کی۔ دیہی علاقوں میں اردو، سندھی بولنے والے مدغم ہو چکے ہیں۔ اور سندھی، پنجابی اور مہاجر لڑکوں میں امتیاز نہیں کیا جا سکتا، سب اچھی طرح سندھی بولتے ہیں۔ اگر موقع دیا جائے تو اگلی نسل میں شہروں میں بھی یہی صورت حال ہو جائے گی۔ ایک مدت تک اردو کو تحفظ دیا جائے۔ اس بات کی ضمانت دی جائے کہ سندھی نہ جاننے کی بنیاد پر کسی شخص کو ملازمت یا تعلیم کے مواقع سے محروم نہیں کیا جائے گا۔ اگر حزبِ اقتدار ہماری تین ترمیمیں جو بل کی دفعات ۱۳، ۱۶ اور ۷ کے لئے پیش کی گئی ہیں۔ منظور کرے تو بل ہمیں قابل قبول ہے۔"

کمال اظفر

" مجھے اس بات سے شدید دکھ ہوا ہے کہ اردو بولنے والوں پر غداری کا الزام لگایا گیا۔ ہم پاکستان اور سندھ کے غدار نہیں ہیں۔ اسمبلی میں اردو بولنے والوں کے خلاف نفرت کی باتیں کہی گئی ہیں۔ ہم اس ملک میں خدمت کے لئے آئے تھے ہم لیٹیرے نہیں ہیں، ڈاکو نہیں ہیں۔ اصل لیٹیرے تو وہ لوگ ہیں جو ہاریوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ ایسی باتوں سے ملک کو ترقی نہیں ہو گی ہمیں یقین ہے کہ ہمارے ساتھ انصاف ہو گا کیونکہ ہم صدر بھٹو پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں۔"

قائدِ ایوان ممتاز علی بھٹو

"حکومت اس امر کی ضمانت دیتی ہے کہ سندھی زبان سے ناواقفیت کی بناء پر کسی سرکاری ملازم کو سبکدوش نہیں کیا جائے گا۔ میں نے حزبِ اختلاف کے ارکان کو یقین دلایا ہے کہ ہم دھوکا نہیں دیں گے اور سندھی کو صوبائی زبان بنانے سے کسی کے حقوق کو نقصان نہیں پہنچنے دیا جائے گا —— آئین کی دفعہ ۲۶۰ میں واضح طور پر اس بات کا تعین کیا گیا ہے کہ صوبائی زبان قومی زبان کے ساتھ رہے گی۔ لسانی بل میں اس آئینی تحفظ کا تذکرہ موجود ہے۔ مجھے اس کا اعادہ کرنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی غیر ضروری الفاظ شامل کرنے سے قومی زبان کو جو تحفظ آئین نے دیا ہے اس میں اضافہ ہو جائے گا۔"

یہ ہنگامے کیوں؟

لسانی تنازعہ کیوں پیدا کیا گیا؟ کیا سندھی اور اردو کے قائدین عوام دوست ہیں؟ اس کا واضح اور دوٹوک جواب یہ ہے کہ سندھی اور اردو کے قائدین وڈیرہ شاہی کے طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور وڈیروں کا تحفظ مطلوب ہے۔ ان کا بنیادی مقصد صوبہ سندھ کے مزدوروں اور ہاریوں کی طبقاتی جدوجہد کو کچلنا ہے۔ پاکستان پیپلز پارٹی نے دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات میں "زمین اس کی جو ہل چلائے۔ کارخانے اس کے جو مشین چلائے" کے نعرے پر ووٹ حاصل کئے اور مسند اقتدار پر فائز ہوئی۔ اس نے لیبر پالیسی اور زرعی اصلاحات کا اعلان کیا۔ دونوں چیزیں مزدوروں اور ہاریوں کے مفادات کے سراسر منافی تھیں۔ زرعی اصلاحات سے وڈیروں اور زمینداروں کے معاشی مفادات پر کوئی ضرب نہیں پڑی۔ چنانچہ حزبِ اختلاف نے ان اصلاحات کے قصیدے گائے اور تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دیئے۔ ۲۲ جون کو سندھ اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے نواب مظفر حسین نے اعتراف کیا کہ "میں خود زمیندار ہوں اور میرے خاندان کے پاس چار پانچ ہزار ایکڑ زمین ہے

اس تنازعہ میں نوکر شاہی نے خوب ہاتھ دکھائے

لیکن زرعی اصلاحات سے ہم قطعی فکرمند نہیں ہیں۔ کیونکہ ہمارے خاندان کو صرف دو یا ایک ایک ایکڑ زمین چھوڑنی ہوگی۔ ایوب خان کی زرعی اصلاحات میں فی خاندان ۳۶ ہزار یونٹ کی حد رکھی گئی تھی۔ لیکن موجودہ اصلاحات میں ۱۲ ہزار یونٹ فی کس حد رکھی گئی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ چھ بھائیوں پر مشتمل ایک خاندان ۷۲ ہزار یونٹ اراضی رکھ سکتا ہے۔" نواب مظفر نے حکومت کو "یہ اچھی اور عوامی زرعی اصلاحات" دینے پر مبارکبادی دیتے ہوئے انکشاف کیا کہ "زرعی اصلاحات سے ایک کسان کو بھی فائدہ نہیں ہوگا۔ کیونکہ جاگیرداروں نے اپنی فاضل زمین پہلے ہی اپنے کامداروں کے نام منتقل کر دی ہے۔" ملاحظہ کیا آپ نے زرعی اصلاحات کی حقیقت، اور حزب اختلاف اور حزب اقتدار کے جاگیردارانہ کردار جب دونوں کے مفادات مشترک تھے، تو یہ ایک دوسرے کے قصیدے پڑھ رہے تھے۔

نئی لیبر پالیسی اور زرعی اصلاحات کا اعلان ہوتے ہی سرمایہ داروں نے مزدوروں کو برطرف اور جاگیرداروں نے ہاریوں کو بے دخل کرنا شروع کر دیا۔ ملوں اور کارخانوں میں تالابندی شروع ہوگئی۔ نوکر شاہی نے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا تحفظ کیا۔ چنانچہ مزدوروں اور ہاریوں نے اپنی طبقاتی جدوجہد تیز کر دی۔ ۷ جون کی مزدور تحریک اس کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ اور ہاریوں نے اراضی پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ ۳۰ مئی کو ضلع دادو کی تحصیل میہڑ کے ایک دیہات کھوٹو باچھی میں دو سو ہاریوں نے ایک زمیندار میرل خاں گرڈانی کی زرعی اراضی پر قبضہ کر لیا۔ میرپور ساکرو، ٹنڈو باگو، ٹنڈو فقیر اور ایئر مارشل اصغر خاں کی زمینوں پر قبضہ کر لیا گیا۔ محنت کشوں کی اس طبقاتی جدوجہد سے استحصالی طبقے خائف ہوئے اور انہوں نے مزدور کو مزدور سے، ہاری کو ہاری سے لڑانے کے لئے لسانی تنازعہ کھڑا کر دیا۔ اسے عوام کا مسئلہ بنایا گیا۔ حالانکہ لسانی مسئلہ موجودہ حالات میں بابو لوگوں کا مسئلہ ہے جو سرکاری ملازمتیں چاہتے ہیں۔ مزدوروں اور ہاریوں کو اس مسئلہ سے کوئی غرض نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کراچی کے صنعتی مزدوروں اور سندھ کے ہاریوں نے ان ہنگاموں میں کوئی حصہ نہیں لیا۔ کیونکہ وہ اپنے دوست اور دشمن کو جان چکے ہیں۔ ان کا طبقاتی شعور بہت بلند ہے۔ اب وہ کسی فریب میں نہیں آسکتے۔

حکومت کی غلطی

حکومت سندھ کو چاہیئے تھا کہ لسانی بل پیش کرنے سے ایک ماہ پہلے رائے عامہ ہموار کرتی۔ عوام، دانشوروں اور تمام طبقے کے افراد کو اظہارِ خیال کی دعوت دیتی۔ جس طرح سے صدر بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے مسئلہ اور شملہ کانفرنس کے بارے میں عوام کو اظہارِ خیال کی دعوت دی تھی۔ اگر حکومت سندھ بھی یہ اقدام کرتی تو یہ ہنگامے نہ ہوتے۔

لسانی تنازعہ سے بھارت نے فائدہ اٹھایا

پاکستان کے دیرینہ دشمن نے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ ۱۲ جولائی کو نئی دہلی میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے مسز اندرا گاندھی نے کہا کہ "بھارت کشمیر کے اس علاقے کو جو پاکستان کے قبضہ میں ہے اپنا علاقہ سمجھتا ہے۔" بھارتی وزیراعظم کا یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ بھارت پاکستان کے اندرونی اختلافات سے پورا پورا فائدہ اٹھا رہا ہے۔

نوکر شاہی کی بھٹو دشمنی

نوکر شاہی پیپلز پارٹی کی حکومت کی بدترین مخالف ہے کیونکہ پیپلز پارٹی نے نوکر شاہی کے تیرہ سو سے زائد افسروں کو برطرف کر دیا۔ چنانچہ نوکر شاہی پیپلز پارٹی سے انتقام لے رہی ہے۔ متحدہ مزدور فیڈریشن اور این۔ ایس۔ ایف (رشید گروپ) نے زبان کے مسئلہ پر واضح موقف اختیار کیا کہ سندھ کی صوبائی زبان سندھی ہونی چاہیئے۔ ان دونوں تنظیموں نے لسانی ہنگاموں میں کوئی حصہ نہیں لیا لیکن کراچی کی انتظامیہ نے این ایس ایف کے چھ اور متحدہ مزدور فیڈریشن کے پانچ رہنماؤں کو گرفتار کر لیا۔ این۔ ایس۔ ایف کے تین رہنماؤں کو شام کو ہی رہا کر دیا گیا۔ باقی افراد تادمِ تحریر پابند سلاسل ہیں۔ ان کی گرفتاری کا مقصد یہ تھا کہ یہ تنظیمیں بھی اس تنازعہ میں شریک ہو جائیں۔ اور اس طرح مزید انتشار اور خلفشار پھیلے۔ متحدہ مزدور فیڈریشن کے صدر جناب عثمان بلوچ نے وزیر اعلیٰ سے ملاقات کی اور تمام حالات سے آگاہ کیا۔ جو ابھی تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہوئی۔

سندھ کی صوبائی زبان سندھی

اسٹالن نے کہا ہے کہ کسانوں کی زبان کو صوبائی زبان بنانی چاہیئے کیونکہ وہ اکثریت میں ہوتے ہیں۔ ان کی زبان کو صوبائی زبان بنانے سے ان کی ترقی ہوگی۔ ان کے بچے اپنی مادری زبان میں تعلیم حاصل کریں گے اور اس طرح ملک اور قوم کی ترقی ہوگی۔ اسٹالن کے اس تجزیہ کی روشنی میں سندھ کی زبان سندھی ہونی چاہیئے۔ لیکن اسٹالن نے یہ بھی کہا ہے کہ اگر کسان اور محنت کش حقِ زبان طلب نہ کریں اور ان کے علاوہ دوسرا طبقہ یہ تحریک چلائے۔ تو وہ تحریک عوام دشمن اور انقلاب دشمن ہوگی۔ سندھ کے موجودہ صورتِ حالات میں ہاری زبان کے مسئلہ پر خاموش ہیں اور اس تنازعہ میں شریک نہیں ہوئے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ موجودہ تحریک عوام دشمن اور انقلاب دشمن ہے۔

میرے خیال میں سندھ کی صوبائی زبان سندھی بنانے سے انقلابی تحریک اور طبقاتی جدوجہد تیز ہوگی۔ سوشلسٹ انقلاب میں کسانوں کی شرکت لازمی اور ناگزیر ہے۔ ان کی شرکت کے بغیر انقلاب نہیں آسکتا کسانوں اور ہاریوں سے رابطہ اردو میں نہیں ان کی مادری زبان کے ذریعے ہی قائم کیا جاسکتا ہے۔ انقلابی مزدور جب دیہات میں جاکر کام کرے گا تو وہ ہاری کی زبان میں بات چیت کر کے ہی اُسے انقلابی شعور سے آراستہ کر سکتا ہے۔ سندھ کے ہاریوں کی اکثریت سندھی بولتی ہے۔ اس لئے انقلابی سندھی سیکھ کر طبقاتی جدوجہد کو تیز کر سکتے ہیں۔ اس لئے سوشلسٹ انقلابی تحریک کو فروغ دینے کے لئے سندھ میں صوبائی زبان سندھی ہونی چاہیئے۔

خیبر سے کیماڑی تک

سرداری لاقانونیت کا دوسرا نام ہے

بلوچستان میں

نیپ کی حکومت یا سرداروں کی

فقیر بخش بگٹی

صوبہ بلوچستان میں نیپ کی حکومت قائم ہو چکی ہے نیپ کے منشور میں سرداری کا خاتمہ شامل ہے۔ مگر حالات کی ستم ظریفی نے یہاں کی حکومت سرداروں کے سپرد کی ہے گورنر بھی سردار ہے، سپیکر بھی سردار ہے اور دو وزیر بھی سردار ہیں۔ ان کے مقابلے میں صرف دو وزیر میر گل خان نصیر اور مولوی صالح محمد، ایسے حضرات ہیں جو عوام میں سے ہیں۔ لہذا یہاں کی حکومت اور کابینہ میں سرداروں کی ایسی غالب اکثریت قائم ہو چکی ہے جس کے مقابلے میں عوامی آواز طاقت اور اثر و رسوخ ایسی اقلیت کی شکل اختیار کر چکے ہیں جو ایک عضوِ معطل کے برابر ہے۔ ان حالات میں عوام ازبس مایوس ہوتے نظر آ رہے ہیں!

تاریخ میں ایسی کوئی ایک مثال بھی نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہو کہ کسی ملک میں جاگیرداری نے سرمایہ داری کے قیام کو برضا و رغبت قبول کیا ہو اور جس میں سرمایہ داری نے اپنے استیصال کے لیے کام کر کے سوشلزم یا عوامی اقتدار کے لیے جگہ خالی کی ہو۔ جب حقیقت یہی کچھ ہے تو پھر یہ بھی خود فریبی اور مہلک غلط فہمی ہی ہو گی کہ یہ تصور کیا جائے کہ عوام دشمن سردار اپنی سرداری سے خود بخود دست بردار ہو کر ان عوام کی اطاعت - زبردستی گوارا کریں گے جن کو انہوں نے صدیوں تک ہر حق سے محروم رکھا جن کو اپنے جوتوں سے کمتر تصور کر کے اپنے ظلم و ستم کا تختۂ مشق بنائے رکھا۔ اور جن کی خون آشامی اور ذلت کو انہوں نے اپنے لئے فخر و مباہات اور علو مرتبت قرار دیا۔

ان حالات میں عوام کی مایوسی قابل فہم ہے۔ او کیوں نہ ہو ... ب کہ وہ یہ بھی بخوبی جانتے ہیں کہ سرداری لاقانونیت کا دوسرا نام ہے۔ اس کی ذاتی مرضی اور اس مرضی پر مبنی اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ اس کی قوم یا قبیلہ کے لئے قانون ہے۔ اور یہ قانون ہر مقام اور ہر موقع پر اور ہر لحاظ سے اس کے ذاتی مفادات کی حفاظت اور عوام کی ذلت و خون آشامی کا غماز ہوتا ہے۔

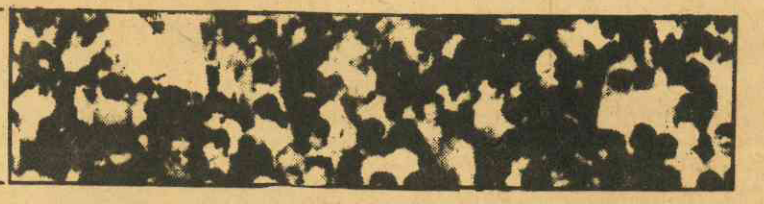
چنانچہ قبائل کے باہمی تضادات اور جنگ و جدل بھی سرداروں کے ذاتی مفادات کا پیدا کردہ ہیں۔ اس کی تازہ مثال مری، بگٹی جکھرانی، بلیدی دگاجانی، اور مزاری کی موجودہ غیر مختتم اور امن سوز لڑائیاں ہیں۔ پھر ان لڑائیوں میں نہ تو مری اور جکھرانی باہم دست و گریباں ہیں نہ مزاری اور بلیدی دگاجانی، بلکہ صرف بگٹی قبیلہ ان سب سے برسرپیکار ہے۔ مذکورہ قبائل صرف بگٹیوں کے برخلاف اپنے اپنے طور پر صف آرا ہیں۔

بگٹی سردار بخوبی جانتے ہیں کہ یہ صورت حال سراسر امن سوز اور ملکی سالمیت کے منافی ہے۔ مگر قبائلی نظام اور سرداری تقاضوں کے عین مطابق وہ اس بھیانک صورت حال کے پشت بان بنے ہوئے ہیں۔ آئے دن بے گناہ افراد قتل ہو رہے ہیں۔ تحصیل جھٹ پٹ ردہ گورانا ڈی میں یہ دوسرا سال ہے کہ گاجانیوں کی اراضیات پٹ فیڈر کے ہوتے ہوئے بگٹیوں کے ہاتھوں بنجر پڑی ہوئی ہیں۔ جھٹ پٹ تحصیل میں تقریباً ہر روز بگٹیوں اور دیگر قبائل میں فائرنگ ہوتی رہتی ہے اور بدامنی اور لوٹ مار معمول بن چکی ہے۔ یہ سب کچھ پولیس کی آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ مگر پولیس خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اس کو حکومت کی طرف سے عدم مداخلت کی ہدایات ملی ہوئی ہوں۔

ایک طرف تو یہ صورت حال ہے دوسری طرف بگٹی قبیلے میں لوگ باہمی معاملات میں انصاف کو ترس رہے ہیں۔ سردار کی ذاتی پسند اور ناپسند کی بنا پر لوگوں کے حقوق مارے جا رہے ہیں۔ بگٹی علاقہ میں ایک اسسٹنٹ کمشنر اور دو تحصیلدار موجود ہیں مگر سردار کے دباؤ کے باعث اور سابقہ حکومتوں کے مظالم کے موجب لوگ ان حکام کے پاس تک نہیں آتے۔ بگٹی تمندار دسا در کی پُرآشوب سیر کر رہے ہیں اور بگٹیوں کے نمائندے سردار احمد نواز خان بگٹی اپنی نجی محفلوں میں یہ فرماتے رہتے ہیں کہ وہ بگٹیوں کے معاملات میں اُن کے تمندار کی مرضی کو معلوم کئے بغیر کسی بھی قسم کی مداخلت کرنے کو تیار نہیں ہیں۔ آج وہ "نیپ" کی حکومت میں وزیر قانون، معدنیات، صنعت و حرفت اور مالیات ہیں۔ نیپ اپنے منشور کے مطابق سرداری نظام کو ختم کرنے کی پابند ہے۔ مگر اس کے صوبائی وزیر قانون اپنے بھائی تمندار کی مرضی یعنی سرداری کی حفاظت و بقاء کو پارٹی کے منشور پر فائق سمجھتے ہیں۔

ان حالات میں عوام حکومت بلوچستان سے بجا طور پر تقاضا کرتے ہیں کہ وہ قانون کا ہر قیمت پر احترام کرائے اور اپنے وزیر قانون صاحب کو خصوصی ہدایات دے کہ وہ قانون کی پابندی کریں۔ ایسا کرنا اس لئے بھی ضروری ہے کہ مالیات، معدنیات اور صنعت و حرفت کے محکمے بھی اُن کے پاس ہیں اور یہ محکمے بھی اساسی طور پر قانون پر متفرع ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بندوبست بھی فوری طور پر کیا جائے کہ مذکورہ قبائل کے مابین امن قائم کیا جائے۔ نہ صرف یہ بلکہ بگٹیوں کے باہمی معاملات میں بھی انصاف اور قانون کی بالادستی قائم کی جائے۔ کیونکہ ایسا کرنے میں سب کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔ اگر نیپ کی حکومت قانون کا احترام کرانے میں ناکام ہوئی اور بڑوں اور سرداروں سے دب کر رہ گئی تو پھر نہ صرف "نیپ" آئندہ کے لئے ختم ہو کر رہ جائیگی بلکہ لاقانونیت اور طوائف الملوکی سے ملکی سالمیت کو بھی ایسا خطرہ لاحق ہو گا۔ جس کا سدباب کسی سے بھی نہ ہو سکے گا۔ امید کرنی چاہیئے کہ نیپ کی صوبائی حکومت اپنی پارٹی کی بقاء کی خاطر صوبے میں قانون کا احترام اور بالادستی قائم کر کے، امن کی فضا پیدا کرے گی۔ ورنہ عوام یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ سرداروں کی حکومت اپنی اپنی سرداریوں کے قیام کی خاطر ملکی مفاد و بقاء کو بھینٹ چڑھانے کو ترجیح دے رہے ہیں۔

(بشکریہ نوائے وطن)



قارئین کہتے ہیں

شیخ الجامعہ نے انھیں تین ٹوپیاں عطا کی تھیں

۱۲ مارچ ۱۹۷۲ء کے روزنامہ "جنگ" کراچی میں "شعبۂ سیاسیات کے معاملات" کے عنوان سے مسٹر محمد عظیم کامراسلہ نظروں سے گزرا۔ اس کے علاوہ اس قسم کے خیالات پر مبنی ایک مضمون کامکار صاحب نے ایک مقامی ہفتہ وار رسالہ میں شائع کروائے۔ چونکہ میں بھی شعبۂ سیاسیات سے بحیثیت ایک طالب علم منسلک رہ چکا ہوں اس لیے مذکورہ مضامین کو پڑھنے کے بعد مجھے یہ احساس ہوا کہ یہ باتیں نہ صرف شعبہ کے وقار پر حملہ ہیں بلکہ ہم طلباء پر بھی کہ جنہوں نے جامعہ کراچی کے اس شعبہ سے ڈگری حاصل کی ہے۔ اس لیے میں نے اپنا فرض سمجھتے ہوئے شعبہ کے معاملات اور حالات کی بذاتِ خود چھان بین کی اور ٹھوس بنیادوں پر حاصل شدہ معلومات جوابی صورت میں درجِ ذیل ہیں۔

یہ قطعی بے بنیاد الزام ہے کہ اس شعبہ میں شخصی اور نظریاتی بنیادوں پر امتیازی سلوک کیا جاتا ہے یا ایسی ہی بنیادوں پر داخلہ دیا جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ طلباء کا داخلہ ان کے امتحانات کے نتائج کی بنیاد پر جامعہ کے قواعد و ضوابط کے مطابق ہوتا ہے اس اصول میں تبدیلی کا مجاز کوئی بھی نہیں ہوتا۔

ان مذکورہ مضامین میں یہ الزام بھی لگایا گیا کہ پروفیسر محمد عزیز احمد صاحب، جناب الیاس صاحب کو زیادتیوں کا شکار بنا کر آئے۔ ——! اس بارے میں پہلے تو میں یہ وضاحت کردوں گا کہ پروفیسر محمد عزیز احمد صاحب و الیاس صاحب نے ایک ہی یونیورسٹی (لکھنؤ) کے ایک ہی شعبہ اور ایک ہی مضمون (سیاسیات) میں ایم اے کیا ہے۔ دوسری وضاحت یہ ہے کہ جناب الیاس صاحب تادمِ مرگ بحیثیتِ پروفیسر اپنے فرائض انجام دیتے رہے۔ مرحوم الیاس صاحب کو نہ تو کبھی مالی نقصان پہنچایا گیا اور نہ ہی ان کے درجہ و حیثیتِ پروفیسری میں کبھی کمی کی گئی۔

یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ صرف ڈاکٹر محمد عزیز احمد صاحب کا ہی بحیثیتِ پروفیسر تقرر ہوا تھا لیکن جناب الیاس صاحب کو بھی فوراً ترقی دے کر پروفیسر بنا دیا گیا تھا۔

بقول کامکار صاحب، ڈاکٹر صاحبِ موصوف کا تقرر جامعہ میں بحیثیتِ پروفیسر محض نااہلی کی بناء پر ہوا ہے۔ غورِ طلب مقام ہے کہ بھلا نااہلی کی صورت میں کسی شخص کو پروفیسر جیسے معزز اور ذمہ دار عہدہ پر کیسے سرفراز کیا جا سکتا ہے۔ پروفیسر کا تقرر ایک سلیکشن کمیٹی کے ذریعے ہوتا ہے جس میں "چانسلر" کے نامزد کیے ہوئے اعلیٰ شہرت یافتہ ماہرین مضمون ہوتے ہیں جن کی سفارش پر سنڈیکیٹ پروانۂ تقرر اجراء کرتی ہے۔

اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ ڈاکٹر محمد عزیز احمد صاحب نے کبھی بھی پروفیسر SHAPPAR یا محترم قریشی صاحب کو اپنے گھر مدعو کیا تھا۔ یہ بات بالکل غلط ہے کہ ڈاکٹر صاحبِ موصوف کو کوئی تدریسی تجربہ نہیں ہے حقیقت یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ برِّصغیر پاک و ہند کی تین جامعات میں آپ کا تدریسی تجربہ پچیس سال سے زائد کا ہے اور موصوف پورے پاکستان کی جامعات میں سب سے پہلے صدرِ شعبہ اور ۱۹۵۱ء میں سب سے پہلے پروفیسر مقرر ہوئے ——!

یہ غلط ہے کہ شعبہ کے تمام اساتذہ کو ممتحن نہیں بنایا گیا بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ شعبہ کے اساتذہ کو باقاعدہ ممتحن نامزد کر دیا گیا تو ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت اساتذہ کی اکثریت نے بیک وقت انکار کر دیا۔ اور ویسے بھی ممتحن بنانے کا کام جامعہ کی انتظامیہ کا ہے صدرِ شعبہ کا نہیں۔ صدرِ شعبہ کا کام محض سفارش کرنا ہوتا ہے اور ایسی سفارش بورڈ آف اسٹڈیز ان پولیٹیکل سائنس کے مشورہ سے کی جاتی ہے جس میں خود شعبہ کے دو سینئر اساتذہ ہوتے ہیں۔

مہدی مصطفےٰ اور نذیر محمد نذیر بھی فرسٹ کلاس طالبعلم ہیں لیکن یہ سراسر دروغ بیانی ہے کہ ان کی حق تلفی کی گئی ہے۔ اس ضمن میں پہلے تو یہ وضاحت ضروری ہے کہ شعبہ میں لیکچررز کی ضرورت کا جب بھی اشتہار دیا گیا ان دونوں نے درخواست دے کر انتخابی بورڈ سے رابطہ قائم کرنے کی کبھی بھی زحمت گوارا نہیں کی۔ دوسرے یہ کہ جناب شاہد علی رضوی و جناب نہال احمد رضوی اور محترمہ سعدیہ صدیقی، جن کا تقرر بحیثیتِ لیکچرار موجودہ صدرِ شعبہ کی ہی سفارش پر کیا گیا کہ وہ فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے ہیں۔

مسٹر کامکار کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ جامعہ سندھ سے رضوان صاحب کو برطرف نہیں کیا گیا تھا۔ ان کی تنخواہ جامعہ کراچی میں وہی مقرر ہوئی جو کہ انہیں جامعہ سندھ سے ملتی تھی۔ اس طرح شاہد صاحب کو شکایت نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ ان کو ایس ایم کالج میں جتنی تنخواہ دی جاتی تھی اس سے کہیں زیادہ یونیورسٹی میں دی گئی۔

جہاں تک آل پاکستان پولیٹیکل سائنس ایسوسی ایشن کا تعلق ہے میں باوثوق ذرائع سے معلومات کی بنیاد پر کہوں گا کہ گزشتہ چار سال سے مسلسل ہنگامی حالات کی بناء پر ایسوسی ایشن کو حکومت کی جانب سے کوئی مدد نہیں ملی۔ لیکن پھر بھی حکومتی قواعد کے تحت سالانہ حسابات چارٹرڈ اکاؤنٹنٹ سے چیک کروا کر گوشوارہ جات حکومت کو پیش کیے جاتے ہیں۔ ہنگامی حالات کی وجہ سے کانفرنس کا انعقاد ممکن نہ ہو سکا۔ ویسے بھی انتخابات کانفرنس کے انعقاد پر ہوتے ہیں اور موجودہ عہدیدار گزشتہ کانفرنس کے منتخب شدہ ہیں۔

جیسا کہ کامکار صاحب نے کہا ہے کہ ڈاکٹر عزیز احمد صاحب اسلام پسند ہستیوں میں سے ایک اہم اور معروف شخصیت ہیں۔ اس کا اعتراف کیا جا سکتا ہے اور اس بات پر ہر مسلمان کو نہ صرف اطمینان بلکہ فخر ہونا چاہیئے، سوائے کامکار کے، جن کو یہ خوبی بُری نظر آ رہی ہے۔ جہاں تک چار ٹوپیوں کی داستان ہے۔ سابق شیخ الجامعہ نے تو ڈاکٹر صاحب موصوف کو تین ٹوپیاں عطا کی تھیں۔ اس بات

سے بھی انکار نہیں کہ موجودہ شیخ الجامعہ نے ان کو رجسٹرارشپ اور انسپکٹر آف کالجز کی مزید دو ٹوپیاں معہ پروفیسری کی ٹوپی کے عطا کی ہیں لیکن باوثوق ذرائع کے مطابق جناب ڈاکٹر نذیر احمد صاحب ثانی الذکر دو ٹوپیاں قبول کرنے سے قطعی انکار کر دیا تھا لیکن شیخ الجامعہ موجودہ کے بہیم اصرار پر موصوف نے حالیہ تفویض کردہ عظیم ذمہ داریوں کو جامعہ کی عظمت اور برتری کی خاطر قبول کر لیا۔ مضمون نگار کو یہ جاننا چاہیئے کہ دنیا میں نام ہی عزیز نہیں ہوتا بلکہ کام بھی عزیز ہوتا ہے۔ شیخ الجامعہ نے موصوف کو ہی ان ثقہ خدمات کا اہل جانا اور ذاتی طور پر اصرار کیا۔

مقبول احمد سعید کراچی

چوری اور غنڈہ گردی میں اضافہ

عوامی نمائندوں کو حکومت کی کرسی سنبھالے ہوئے چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا ہے۔ حکومت نے اصلاحات تو نافذ کر دیں لیکن غنڈہ گردی اور چوری چکاری کی طرف کوئی توجہ نہ دی، آخر ایسا کیوں؟ پورے ملک میں چوری چکاری عام ہو چکی ہے اور اب تو دن دہاڑے ایسا ہونے لگا ہے۔ خاص طور سے صوبہ سندھ کے عوام میں اس کی وجہ سے خوف و ہراس پھیلا ہوا ہے۔ ابھی حال ہی کا واقعہ ہے کہ صرف تین آدمیوں نے دن دہاڑے کراچی کا ایک بنک لوٹ لیا اور دوسرا بنک لوٹنے کی کوشش کی۔ میں حکومت سے یہ سوال کرتا ہوں کہ یہ ڈاکے اور چوریاں عوامی حکومت کے دور میں کیوں ہو رہی ہیں۔ کیا حکومت ان حالات سے بے خبر ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو ہو سکتا ہے کہ عوام کے اندر انتشار پیدا ہو جائے۔ اور وہ ان باتوں کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ کیا صدر بھٹو کو یہ تمام باتیں معلوم نہیں۔ صدر بھٹو کے حالات بالکل ایوب خان جیسے ہو رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ انہیں کسی بات کی خبر نہ ہو اور یہ تمام باتیں ان کے مشیر، وزیر اور گورنر اُن تک نہ پہنچاتے ہوں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ چوری، اغوا اور ڈاکے کی وارداتیں جان بوجھ کر کروائی جا رہی ہوں تاکہ عوام میں بھٹو کی مقبولیت ختم ہو جائے اور عوام بھٹو صاحب سے بیزار ہو جائیں میں آخر میں یہ بات پھر کہوں گا کہ حکومت چوری، اغوا اور ڈاکے کی وارداتوں کی طرف توجہ دے۔ اگر حکومت کی طرف سے ان وارداتوں کی طرف کوئی توجہ نہ دی گئی تو ہو سکتا ہے کہ خدانخواستہ یہ ملک جو باقی بچا ہے وہ بھی ختم ہو جائے اور ہم کسی کے غلام بن جائیں۔

(زاہد حسین —— کراچی)

جماعت اسلامی نیپ اور سرمایہ داروں کا گٹھ جوڑ

صفحہ ۶ سے آگے

کا اس نے مطالبہ کیا۔ "جئے سندھ" تحریک کو اس نے جنم بھی دیا اور پروان بھی چڑھایا۔ نیپ کے رہنما جام ساقی اس کے ممتاز رہنما ہیں۔ اس مقصد کے لئے اس نے جی ایم۔ سید سے ساز باز کی۔

زیادہ مدت نہیں گزری گذشتہ جنوری کا ذکر ہے کراچی میں نیپ کا کنونشن ہوا۔ اس موقع پر نیپ کے زیر اہتمام اردو اور سندھی پر مذاکرہ ہوا۔ جس میں اتفاق رائے سے یہ قرارداد منظور کی گئی کہ سندھی کو سندھ کی واحد سرکاری زبان بنایا جائے۔ قومی سطح پر اردو کے بجائے سندھی، پشتو، پنجابی اور بلوچی کو قومی زبانوں کا درجہ دیا جائے۔ اس مذاکرے کی تمام تفصیلات اخبارات میں شائع ہوئیں۔ اس پر احتجاج ہوا۔ اخبارات نے مخالفت میں اداریے لکھے۔ اردو کے حامیوں کے بیانات شائع کئے۔ لیکن نیپ نے نہ کوئی تردید کی نہ وضاحت، اپنے گمراہ کن موقف پر قائم رہی۔

وہی نیپ جو کل اردو کی شدید مخالف تھی۔ آج اس کی حامی ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ سبب اس کا یہ ہے کہ نیپ کی موقع پرستی جب سندھی عوام پر واضح ہو گئی تو اس کا بھرم جاتا رہا۔ جئے سندھ تحریک اس کے ہاتھ سے نکل کر پہلے ہی جی۔ایم۔ سید کے ہاتھ میں جا چکی تھی۔ پچھلے چند ماہ میں لغاری گروپ اور عزیز اللہ گروپ کی سیاسی رسہ کشی کے باعث سندھ میں اس کا اثر بالکل ختم ہو گیا عثمانی نے پہلے تو لغاری کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے سندھ میں اپنی لیڈری قائم رکھنے کی کوشش کی۔ مگر جب اس میں ناکامی ہوئی تو انہوں نے کراچی پر تکیہ کیا۔

محمودالحق عثمانی کی کمزوریوں کا سلسلہ خاصہ طویل ہے۔ جب وہ عوامی لیگ میں تھے اور حسین شہید سہروردی وزیر اعظم بنے تو انہوں نے جھٹ نیا سوٹ سلوایا اور وزارت کے خواب دیکھنے لگے۔ مگر قسمت نے یاوری نہ کی بعرصہ دراز تک انتظار کرنے کے بعد انہوں نے سفارت کی آس لگائی مگر وہ بھی ہاتھ نہ آئی۔ عوامی لیگ سے نکالے گئے تو نیپ کے گلے میں پڑے۔ اس مرحلے پر انہوں نے قومی اسمبلی کا رکن بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے۔ انتخابات میں حصہ لیا۔ شکست کھائی، ضمانت بھی ضبط کرائی۔ کئی سال سے ان کی یہی روش ہے۔ انتخابات لڑتے ہیں اور بڑی شان و شوکت سے ضمانت ضبط کرواتے ہیں۔

پچھلے انتخابات میں بھی ان کا یہی حشر ہوا لیکن اس شرمناک شکست سے انہوں نے پہلی بار سبق حاصل کیا۔ اب انہوں نے کراچی کا میئر بننے کی ٹھانی ہے۔ میونسپل کارپوریشن کا انتخاب لڑنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ اکثریت حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ پچھلے مہینے سے لالوکھیت اور ناظم آباد کے گلی کوچوں میں منڈلاتے نظر آتے ہیں۔ سندھ سے ناطہ توڑ کر کراچی کا دم بھرتے ہیں مہاجرین پر بڑی طرح مہربان ہیں۔ اردو کے درد میں بے چین و بے قرار ہیں۔

پہلے اٹھتے بیٹھتے کہتے تھے —— "ہم اسلامی سوشلزم نہیں چاہتے، سائنٹیفک سوشلزم چاہتے ہیں"۔ اب وہ سرے سے ہی کسی سوشلزم کے قائل نہیں، اسلام پسندی کا کھلے عام پرچار کرتے ہیں۔ مودودیوں سے کچھ عرصہ چھپ چھپ کر راز و نیاز کرتے رہے۔ اب ان کے دوش بدوش عوام کے خلاف مورچہ لگاتے ہیں، مہاجروں کے نام پر متحدہ محاذ بناتے ہیں، پیپلز پارٹی کے خلاف جوڑ توڑ کرتے ہیں صبح و شام اردو کا وظیفہ پڑھتے ہیں، اردو صوبہ بنانے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ پہلے مغربی پاکستان میں چار قومیں بتاتے تھے اب انہوں نے پانچ قومیں دریافت کرلی ہیں۔ یہ نئی قومیت "مہاجرین" ہیں۔ اس تعریف کے مطابق ویسے تو کراچی میں اور بھی قومیں پائی جاتی ہیں مگر گجراتیوں کا حق سب سے پہلے ہے۔ یہ بات شاید عثمانی کے ذہن میں نہ آئی۔

محمودالحق عثمانی ان سیاست والوں میں سے ہیں جو زندگی بھر سیاست لڑاتے ہیں۔ مگر علم سیاست کا مطالعہ کرنے کی کبھی زحمت گوارہ نہیں کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں یہ نہیں معلوم کہ قوم کیا ہوتی ہے، قوم اور قومیت میں کیا فرق ہوتا ہے۔ قومیت تاریخ کے کس ارتقائی مرحلہ پر تشکیل پاتی ہے اس کے عناصر ترکیبی کیا ہیں۔ طبقات کا اس میں کیا رشتہ ہوتا ہے۔ ان کی لاعلمی کا یہ عالم ہے

کہ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ کسان اور جاگیر دار طبقہ، قبائل کے امتزاج سے کب جاگیر داری قومیت کو جنم دیتا ہے کب جاگیر داری کی شکست و ریخت سے مزدور اور سرمایہ دار طبقہ بورژوا قومیت کو جنم دیتا ہے۔

وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ مہاجر سرے سے وہ طبقہ ہی نہیں جو کسی قومیت کی تشکیل کر سکے۔ وہ یہ بھی نہیں جانتے کہ مہاجروں کو اگر قومیت قرار دے دیا گیا تو اردو صرف لالوکھیت اور ناظم آباد کی زبان رہ جائے گی قومی زبان نہ رہے گی۔ یہ اردو کی حمایت نہیں اس کے خلاف سازش ہے، اس کا مرتبہ گھٹانا ہے، اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپنا ہے۔

اس معاملہ میں محمود الحق عثمانی اور احتشام الحق تھانوی میں کوئی فرق نہیں۔ عثمانی مہاجروں کو قومیت بتاتے ہیں اور تھانوی تمام پاکستانیوں کو اسلامی قومیت قرار دیتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نیپ نے موقع پرستی کے ساتھ "جہالت" کو بھی اپنا شعار بنا لیا ہے۔

غالباً یہ جماعتِ اسلامی کی صحبت کا اثر ہے۔ مودودیوں نے پہلے پاکستان کو "کافرستان" قرار دیا، اب اس کے عاشق صادق بنے پھرتے ہیں۔ مودودیوں نے قائدِ اعظمؒ کو "کافرِ اعظم" کہا اب صبح و شام ان کے نام کا وِرد کرتے ہیں۔ مودودیوں نے نظریہ پاکستان کو "احمقانہ تصور" قرار دیا اب اس کے امین و محافظ ہونے کے دعویدار ہیں۔ مودودیوں نے جہادِ کشمیر کو "حرام موت" بتایا۔ اب انہیں کشمیر کے حریت پسند عوام کا غم کھائے جاتا ہے۔

مودودیوں نے انتخابات میں اسلام کو داؤں پر لگا دیا عبرتناک شکست کھائی اور اسلام کو بدنام کروایا۔ ناپختہ ذہنوں سے اس کا احترام ختم کر دیا۔ پھر نظریہ پاکستان کے نام پر مشرقی پاکستان میں قتل عام کرایا۔ اس طرح مشرقی پاکستان بھی ہاتھ سے گیا اور نظریہ پاکستان بھی طرح طرح کے شبہات کا شکار ہوا اب ساڑھے پانچ کروڑ پاکستانی عوام کی زبان اردو کو مودودیوں نے اپنا نیا حربہ بنایا ہے۔ نیپ کے ترمیم پسندوں سے گٹھ جوڑ کیا۔ اردو کا ان دونوں کے ہاتھوں کیا حشر ہوگا۔ اس کے تصور سے دل لرزتا ہے۔

لیکن جماعت اسلامی اور نیپ کے ہاتھوں اردو کا تو کچھ نہ بگڑے گا، اس لئے کہ وہ ایک صحت مند اور پھلتی پھولتی زبان ہے۔ اس کے محافظ پاکستان کے کروڑوں عوام ہیں۔ البتہ اردو کے نام پر دونوں نے مہاجروں اور سندھیوں کو لڑا دیا۔ نفرت اور عداوت کا ایسا بیج بویا کہ مشرقی پاکستان کا المیہ یاد آتا ہے۔ نام اردو کا ہے۔ مقصد پیپلز پارٹی سے انتخابات کی شکست کا انتقام لینا ہے۔ میونسپل کارپوریشن کے انتخابات میں مہاجرین کے ووٹ حاصل کرنا ہے۔

بعض حلقوں میں کھلم کھلا یہ کہا جا رہا ہے کہ مزدوروں کی حالیہ انقلابی تحریک سے خائف ہو کر کراچی کے سرمایہ داروں نے ۲۰ لاکھ کی رقم تقسیم کی ہے۔ کیا سندھی مہاجر جھگڑا اسی سازش کا نتیجہ ہے؟ جواب اس کا آنے والا وقت دے گا البتہ یہ سننے میں ضرور آیا ہے کہ محمود الحق عثمانی اور جماعت کے بعض رہنماؤں کی کراچی کے سرمایہ داروں سے ان دنوں طویل ملاقاتیں ہو رہی ہیں۔ جن میں پیپلز پارٹی کی حکومت کے خلاف منصوبے بناتے ہیں۔ صدر بھٹو کو ناکام بنانے کی سازشیں کرتے ہیں۔

اظہارِ تعزیت

ادارہ الفتح ملک کے ممتاز صحافی اور روزنامہ مشرق کے بانی جناب عنایت اللہ کی وفات پر گہرے رنج و غم کا اظہار کرتا ہے اور مرحوم کے پسماندگان سے اظہارِ ہمدردی کرتا ہے

بقیہ: اداریہ

کیا گیا۔ انہیں سرمایہ داروں کے ایجنٹ کا خطاب دیا گیا ان کے وارنٹ جاری کرائے گئے۔ ان پر غنڈوں سے حملے کرائے گئے۔ یہ اپریشن اتنا اذیت ناک تھا کہ کارکنوں کو پارٹی سے نفرت ہونے لگی۔ حال ہی میں کراچی کمیٹی کی نامزدگیوں نے تو رہا سہا بھرم بھی نہ رہنے دیا۔ کارکن کھل کر سامنے آ گئے اور اس طرح کراچی میں پارٹی چند لوگوں کی میراث بن گئی۔

جے۔ اے۔ رحیم اور ان کے حواریوں کو کراچی کے حالیہ ہنگاموں میں احساس ہو گیا ہوگا کہ پارٹی کہاں ہے؟ انہوں نے اتنا بڑا ظلم کیا ہے کہ سیاسی پارٹیوں کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ کراچی میں پارٹی کے پرچم جلائے گئے۔ دفاتر کو آگ لگی۔ مخالفین نے پیپلز پارٹی کا جنازہ نکالنے کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔

یوں معلوم ہوتا تھا کہ پیپلز پارٹی کا وجود تک نہیں، کوئی ایک فرد بھی نہیں جو اپنی پارٹی کے پرچم کو بچانے کے لیے جان پر کھیل جائے، پرچم کو سینے سے لگائے، جسم سے لپیٹے اور پھر چاہے تو اسے کوئی گولی مار دے یا نذرِ آتش کر دے۔

افسوس! یہ عمل زندہ رکھنے والے توجے اے رحیم اور ان کے ساتھیوں کی نذر ہو گئے۔

افسوس! کراچی پیپلز پارٹی سے محروم ہو گیا۔

اب بھی وقت ہے اُن لوگوں کے لیے جو عوام سے سبق حاصل کرتے ہیں۔

عوام ہی طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ اپنی تنظیموں سے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کو نکال دو۔ تم نے ان کے تسلّط کو مزید برداشت کیا تو رجعت پسند حاوی ہو جائیں گے۔ آج سیاسی عمل بورژوا جماعتوں کی شکست اور انقلابی طاقتوں کی فتح کی صورت میں رونما ہو رہا ہے۔ سُرخ پرچم اٹھانے والے ان عوام دشمنوں پر کڑی نگاہ رکھنے کی ضرورت ہے جو بالآخر اس پرچم کو ہی سرنگوں کریں گے۔ آج کل یہ لوگ زیادہ سرگرمِ عمل ہیں۔

بقیہ: افسانہ

چوتھا آدمی پیچھے کھڑا ہے۔ وہ اس کارِ خیر میں ہمارا ہاتھ نہیں بٹا سکتا۔ تدفین سے فراغت پانے کے بعد ہم دعا مانگ رہے ہیں —— چوتھا آدمی رقّت آمیز لہجہ میں دعا مانگ رہا ہے —— رامو کا باپ اپنے اکلوتے بیٹے کی یاد میں رو رہا ہے۔

دعائے مغفرت کے بعد میں چوتھے آدمی کی طرف بڑھتا ہوں تاکہ اس کے ہاتھ چوم سکوں —— لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے —— جیسے زمین نے سختی سے میرے پاؤں جکڑ رکھے ہوں —— چوتھے آدمی کی کانپتی ہوئی آواز میرے کانوں سے ٹکراتی ہے ——

—— چوتھا آدمی رامو کے باپ سے کہہ رہا ہے

"بابا! تو بچہ —— ہماری مزدوری نکالو!"

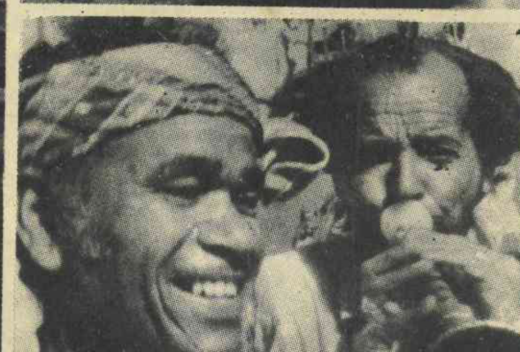
درختوں پر سے پرندے چیختے ہوئے اُڑ گئے۔

چوتھا آدمی —— چوتھا آدمی —— !!!!









Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
13 — 27 July — 1972